دریائے سندھ کا کچے کا علاقہ

پالیسی سازی، ناجائز قبضے اور انتظامی بے قاعدگیوں کا جائزہ

PILER

پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لیبر ایجوکیشن اینڈ ریسرچ

پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لیبر ایجوکیشن اینڈ ریسرچ

پائلر ایک جمہوری اور موثر مزدور تحریک کے ذریعے سماجی انصاف کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔ پائلر کی بنیاد ایک غیر منافع بخش ادارے کے طور پر 1982 ڈالی گئی۔ پائلر کی حکمت عملی کا مرکز، تحقیق و پیروکاری اور تعلیم و تربیت کے ذریعے محنت کشوں (مرد اور عورتوں) اور اتحادی گروپوں کو مضبوط و متحرک کرنا، ان کے مسائل کو سیاسی اور سماجی سطح پر اجاگر کرنا اور بنیادی مزدور حقوق پر وسیع تر یکجہتی کو فروغ دینا ہے۔ امن کے قیام، فوجی تسلط اور بالخصوص جنوبی ایشیا کے خطے میں جوہری ہتھیاروں کے خاتمے کے لیے بدستور مخلص اور پُرعزم رہتے ہوئے پائلر قومی اور علاقائی سطح پر متعدد امن تحریکوں کا رکن ہے اور پاکستان کی مزدور تحریک کو امن تحریک سے جوڑنے کی کوششوں میں مصروفِ عمل ہے۔

دریائے سندھ کا کچے کا علاقہ

پالیسی سازی، ناجائز قبضے اور انتظامی بے قاعدگیوں کا جائزہ

PILER

پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لیبر ایجوکیشن اینڈ ریسرچ

پائلر سینٹر، گلشن معمار، کراچی، 75340، پاکستان

© پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لیبر ایجوکیشن اینڈ ریسرچ
2013ء

تحریر: راحب علی

نظر ثانی: آصف شکیل

اہتمام: عبدالسلام سلامی

صفحہ سازی: احمد گرافکس، کراچی

یہ کتابچہ ٹیرے ڈی ہومز (Tdh) اور میڈیکو انٹرنیشنل کے مالی تعاون سے شائع کیا گیا ہے۔

ناشر: پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لیبر ایجوکیشن اینڈ ریسرچ
پائلر سینٹر، ایس ٹی-001، سیکٹر 'X' سب سیکٹر 'V'، گلشنِ معمار، کراچی۔
فون: 7-36351145 (21-92) فیکس: 36350354 (21-92)
ای میل: piler@cyber.net.pk ویب سائٹ: www.piler.org.pk

فہرست

پیش لفظ 5
تعارف 7
تحقیق کا طریقہ 8
پس منظر 8
کچے کی موجودہ صورتحال 10
دریائے سندھ 10
دریائے سندھ میں پانی کے بہاؤ اور کچے کی آبادی میں اضافے کا باہمی تعلق ... 12
کچے کے باشندوں کے حالات 15
سندھ کے مختلف اضلاع میں کچے کی زمین کی لیز اور قبضہ 17
کچے کی زمین کی غیرقانونی لیزنگ 19
کچے پر قبضے کے سماجی اثرات 20
پالیسی سازی اور دریائی جنگلات 21
جنگلات پالیسی 1962ء 22
1975ء کی جنگلات پالیسی 22
جنگلات پالیسی 1980ء 23
لیز پالیسی 1991ء 24
ایگروفاریسٹ لیز پالیسی 2004ء 24
سیٹلائٹ تصاویر کے مطابق حیدرآباد اور نواب شاہ میں کچے کی صورت حال ... 25

1980ء کی جنگلات پالیسی کے بعد کچے کی صورتحال 26
1991ء کی جنگلات پالیسی کے بعد کچے کی صورتحال 26
ایگروفاریسٹ لیز پالیسی 2004ء کے اثرات 27
شہروں اور دیہات کی ترقی میں فرق 29
سندھ کی آبی گزرگاہوں کی تاریخ 32
2010ء کا سیلاب: اسباب اور نقصانات 35
سرکاری امداد 36
آبادگاروں اور ہاریوں میں مفت بیج اور کھاد کی تقسیم 36
سماجی اور اقتصادی حالات 37
کچے کے گاؤں اور گھروں کا ڈھانچہ 38
پینے کے پانی کی سہولتیں 39
اسکول 40
بنیادی سہولتیں 40
علاج معالجے کی سہولتیں 40
ذرائع آمدن 41
ذرائع آمدن پر قدرتی آفات کے اثرات 42
کچے کے متاثرین کی بحالی 42
امن و امان کی صورتحال اور برادریوں کی طاقت کا روزگار پر اثر 43
سماجی، سیاسی اور طبقاتی محرومیاں 44
چیف جسٹس آف پاکستان کا کچے میں قبضہ مافیا کے خلاف اقدام 44
حاصلِ مطالعہ 44
سفارشات 48
حوالہ جات 50

پیش لفظ

صوبۂ سندھ کا کچے کا علاقہ سیلابی موسم میں دریا کے تیز بہاؤ کو راستہ فراہم کرنے اور انسانی آبادیوں کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہے۔ جنگلات، آب گاہوں، جنگلی اور آبی حیات، مویشیوں اور ان سب کے ذیلی فائدوں کی صورت میں یہ علاقہ قومی دولت کے لیے زبردست قدرتی وسیلہ بھی ہے۔

بیس لاکھ 11 ہزار ایکڑ سے زیادہ رقبے کے اس وسیع علاقے کا انتظام بہتر انداز میں کیا جاتا تو آج یہ نہ صرف صوبۂ سندھ بلکہ پورے ملک کی خوش حالی میں اہم کردار ادا کر رہا ہوتا۔ لیکن گزشتہ 59 برسوں میں یکے بعد دیگر آنے والی فوجی اور جمہوری حکومتوں نے اس علاقے کے لیے جس قسم کی پالیسیاں اختیار کیں، ان میں قومی اور عوامی مفادات کا خیال کم رکھا گیا۔

کچے کے علاقے پر ناجائز قبضے اور تجاوزات کی وجہ سے بارشوں کے موسم میں اسے سیلاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پینتیس سال پہلے اس علاقے میں 42 فیصد رقبے پر جنگلات تھے، لیکن درختوں کی مسلسل کٹائی اور کچے کی زمین کے زرعی استعمال میں اضافے کی وجہ سے 2010ء میں جنگلات کا رقبہ 0.72 فیصد رہ گیا۔ قابضین نے زیر قبضہ زرعی زمینوں کی حفاظت کے لیے بند بنالیے ہیں جو دریا کے قدرتی بہاؤ میں بڑی رکاوٹ ہیں۔ بیالیس سال پہلے اس علاقے میں ساڑھے سات لاکھ افراد بستے تھے، آج یہاں کی آبادی 35 لاکھ سے زیادہ ہے۔ مون سون کے موسم میں تیز بارشوں اور پہاڑوں پر برف کے پگھلنے سے دریا میں سیلاب آتا

ہے تو اس آبادی کو نہ صرف گھر بار چھوڑنا پڑتا ہے بلکہ جانی اور مالی نقصانات بھی اٹھانے پڑتے ہیں۔

زندگی کی بنیادی سہولتوں (محفوظ رہائش، پینے کا پانی، علاج، تعلیم وغیرہ) کے فقدان اور روزگار کے نہایت محدود مواقع کی وجہ سے یہاں رہنے والوں کی زندگی، جو پہلے ہی مشکلات کا شکار ہے، سیلاب کی وجہ سے ناقابلِ بیان ہوجاتی ہے۔

زیرِ نظر تحقیقی مطالعے میں سندھ کے کچے کے علاقے کے امکانات، غیر قانونی قبضوں کے رجحان، سرکاری پالیسیاں اور انتظامات، با اثر سیاسی شخصیات کے وابستہ مفادات اور سرکاری محکموں کی غفلت اور عدم کارکردگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جائزے میں کچے کے علاقے کے لیے از سرِ نو حقیقت پسندانہ پالیسی بنانے، نافذ کرنے اور علاقے کے انتظام کو بہتر کرنے کے لیے تجاویز دی گئی ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ سندھ کے مقتدر حلقے اس قیمتی قدرتی وسیلے کے تحفظ اور بہتر انتظام کاری کے ذریعے اسے سندھ کے عوام کی خوش حالی کا ذریعہ بنانے میں اپنا کردار ادا کریں گے۔

تعارف

دریائے سندھ میں آنے والے ہر سیلاب سے آبادی کا بڑا حصہ متاثر ہوتا ہے اور یہ معمول بن چکا ہے۔ بارہا ہونے والے نقصانات کے باوجود اب تک اس مسئلے کا ایسا مستقل حل نہیں نکالا جاسکا ہے جو قدرتی ماحول اور اس نظام کے اثرات سے ہونے والے نقصانات سے آبادی کو محفوظ رکھ سکے۔ 2010ء کے تباہ کن ترین سیلاب میں سب سے زیادہ نقصان کچے کے باسیوں کا ہوا کیوں کہ سیلاب کے نتیجے میں کچے کی پوری اراضی زیرِ آب آ گئی تھی۔

مطالعاتی جائزے میں یہ بات سامنے آئی کہ سیلاب سے کچے کے علاقوں میں ہونے والے نقصانات کی سب سے بڑی وجہ کچے سے متعلق اداروں کی پالیسیوں اور انتظام کاری کے نظام میں موجود خامیاں ہیں۔اس کے علاوہ ان اداروں میں سیاسی اثر ورسوخ کے حامل افراد کے عمل دخل کی وجہ سے کچے کی زمین پر قبضے کا معاملہ کاروبار بن گیا، جس سے نہ صرف دریا کے قدرتی بہاؤ کو نقصان پہنچا بلکہ کچے کی مقامی آبادی کو بھی اُس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔اس تحقیق میں کچے کی تاریخ، وقت کے ساتھ کچے کی آبادی و اراضی میں آنے والی تبدیلیوں، سرکاری پالیسیوں اور اُن پر عمل درآمد کی صورت حال، کچے کی زمین پر قبضے اور دیگر متعلقہ موضوعات کا تفصیلی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ہر موسمِ برسات میں ہونے والی تباہی کے اسباب کو سائنسی بنیادوں پر سمجھا جاسکے۔

تحقیق کا طریقہ

اس تحقیقی مطالعے میں، تحقیق کے بنیادی (پرائمری) اور ثانوی (سیکنڈری) دونوں طرح کے مواد سے مدد لی گئی ہے۔ ثانوی مواد کے لیے تحقیقی رپورٹوں ،مضامین، کتب اور اخبارات سے مدد لی گئی ہے جب کہ بنیادی معلومات کے لیے کچے کے تین مخصوص علاقوں، کھیبر انی، سالارو اور ڈیلٹا، میں فوکس گروپ مباحثے کیے گئے۔ ہر فوکس گروپ میں آٹھ افراد شامل تھے۔ گروپوں سے کچے میں بڑھتی ہوئی آبادی کے اسباب، کچے کی زمین پر قبضے اور سیاسی عوامل، کچے کی گزشتہ اورحالیہ صورت حال اور سیلاب سے پہلے اور سیلاب سے پیدا ہونے والے حالات کے متعلق سوالات پوچھے گئے۔ تین ماہرین کے انٹرویو کیے گئے جن میں دریائی جنگلات کے قانون اور پالیسیوں اور آبپاشی کے نظام کے متعلق سوالات پوچھے گئے۔ ماہرین میں آبپاشی نظام کے ماہر ادریس راجپوت، جنگلات کے ماہرزین داؤد پوتہ اور زرعی ماہر پروفیسر اسماعیل کنبھر شامل ہیں۔

پس منظر

پانی انسان کی اہم ترین ضرورت ہے۔ جب تک انسان نے ترقی نہیں کی تھی ،وہ اُن علاقوں میں رہنے کو ترجیح دیتا تھا جہاں پانی کی سہولت پہلے سے دستیاب ہو۔ اس بات کا اندازہ دنیا کی پرانی تہذیبوں کی آثار سے لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً مصری تہذیب کے آثار دریائے نیل کے کنارے پر، بابلی تہذیب کے آثار دریائے فرات کے کنارے اور سندھ کی قدیم تہذیب کے آثار دریائے دجلہ کے کنارے پر پائے جاتے ہیں۔ کئی چھوٹے بڑے شہر آج بھی دریاؤں کے کناروں پر آباد ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پچھلے وقتوں کی معیشت اور گزراوقات کا دارومدار دریاؤں کے بہاؤ پر ہوتا تھا۔

سندھ کی زرخیز زمینوں کی ہریالی اور ان کی خوشحالی کا دارومدار بھی دریائے سندھ کے پانی کی

دستیابی پر ہے جو کشمور سے کیٹی بندر تک، پورے سندھ کو سیراب کرتا ہے۔ 1842ء میں جب انگریزوں نے سندھ فتح کیا تو علاقے کی زرخیز زمینوں کو آباد کرنے اور ان سے زیادہ اناج حاصل کرنے کے لیے 1843ء میں جنگلات اور نہروں کے محکمے کا قیام عمل میں لایا گیا[1]۔ لیفٹننٹ کرنل والٹر اسکاٹ کو اس محکمے کا سربراہ مقرر کیا گیا اور انھیں پورے سندھ کا دورہ کر کے ایک ایسا منصوبہ تیار کرنے کی ذمے داری سونپی گئی جس کی بنیاد پر دریائے سندھ کے پانی کو زرعی استعمال میں لایا جاسکے۔ والٹر اسکاٹ نے دورے کے بعد رپورٹ میں تجویز پیش کی کہ بارشوں کے موسم میں ہمالیہ، ہندوکش اور قراقرم کے پہاڑوں سے بڑی مقدار میں پانی آتا ہے، اس پانی کو بند بنا کر روکنا نقصان دہ ہوگا، تاہم سکھر اور خیرپور جیسے اونچے مقامات پر بیراج تعمیر کیا جاسکتا ہے، تاہم فی الوقت دریا کی پرانی قدرتی ذیلی نہروں کی مرمت کر کے ان کے ذریعے کھیتوں تک پانی پہنچایا جاسکتا ہے۔ ذیلی نہروں کی مرمت کے ساتھ دریا کے پانی پر قابو پانے کے لیے 1860ء میں دریا کے دونوں اطراف پشتے بنانے کا کام شروع کیا گیا۔ برطانوی حکومت نے دریائے سندھ کے پانی کو زرعی استعمال میں لانے کے لیے 1932ء میں سکھر کے مقام پر بیراج کی تعمیر مکمل کر لی اور ساتھ ہی پرانی ذیلی نہروں کو بڑی نہروں میں تبدیل کر دیا گیا۔ بیراج اور پشتے بنانے کا کام 1960ء تک جاری رہا۔ اس طرح دریا کے پانی کو سندھ کے پس ماندہ علاقوں تک پہنچا دیا گیا[2]۔ اس عمل کے نتیجے میں دور دور تک پھیلے سیلابی علاقے اب صرف دریا کے دونوں پشتوں کے درمیانی حصے میں رہ گئے جسے مقامی زبان میں کچا کہا جاتا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق کشمور سے ڈیلٹا تک دریائے سندھ کے دونوں حفاظتی پشتوں کے درمیان بیس لاکھ گیارہ ہزار دوسو ایکڑ اراضی موجود ہے[3]۔ اس میں سے 10 لاکھ ایکڑ اراضی زرعی استعمال میں ہے اور 6 لاکھ سے سے زائد زمین مرکزی دھارے میں آتی ہے۔ 4 لاکھ 50 ہزار ایکڑ زمین محکمۂ جنگلات کے زیرِ استعمال ہے اور باقی 50 ہزار ایکڑ اراضی پر دریائی جھیلیں اور چند گاؤں آباد ہیں جہاں کاشتکاری نہیں ہوتی، لیکن شدید سیلاب کی صورت میں یہ

دیہات زیرِ آب آجاتے ہیں۔

کچے کی موجودہ صورتحال

زرعی ممالک کی آبادی کے بڑے حصے کا انحصار دریاؤں کے پانی پر ہوتا ہے جس کی وجہ سے آبادی دریاؤں کے قریبی علاقوں میں رہائش کو ترجیح دیتی ہے۔ دریا کے کنارے واقع زمینوں یعنی کچے میں مستقل رہائش اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تاکہ دریا کا قدرتی بہاؤ متاثر نہ ہو۔

دریائے سندھ

اپنے تیز بہاؤ کی وجہ سے دریائے سندھ کا شمار دنیا کے بڑے دریاؤں میں کیا جاتا ہے تاہم ریاستی اداروں کی پالیسیوں اور عدم توجہی کے باعث دریا کے قدرتی بہاؤ میں رکاوٹیں پیدا ہوگئیں۔ گزشتہ بیس برس کے دوران دریائے سندھ میں پانی کی مقدار میں کمی واقع ہوئی ہے، جس سے دریائی جنگلات بھی کم ہوتے چلے گئے کیونکہ جنگلات کے لیے درکار پانی ناپید ہو گیا۔ حکومت نے جنگلات کے رقبے میں اضافے کے لیے جو بھی اقدامات اور پالیسیاں متعارف کرائیں اُن سے کوئی بہتری نہ آسکی۔ انہی پالیسیوں کے تحت حکومت اور محکمۂ جنگلات نے کچے کی لاکھوں ایکڑ زمین پٹے (لیز) پر دے دی[4]۔ لیزنگ پالیسی سے فائدہ اٹھا کر بااثر جاگیرداروں اور زمینداروں نے زمین پٹے پر حاصل کرنے کے بعد موجود جنگلات کو شدید نقصان پہنچایا۔

سرکاری اعداد شمار کے مطابق اس وقت 17 لاکھ 86 ہزار سے زائد ایکڑ کچے کی اراضی پر بااثر لوگوں کا قبضہ ہے[5] جن کے خلاف، بقول حکومتی نمائندگان، قانونی کارروائی کی جارہی ہے۔ قابضین نے کچے کے علاقوں میں زمینوں کو آباد کرنے کے لیے نجی ٹیوب ویل لگا رکھے ہیں اور کاشت کاری کے لیے درختوں کی غیر قانونی کٹائی کے مرتکب بھی ہوئے ہیں جس سے

دریائی جنگلات کو بھاری نقصان پہنچا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی فصلوں کو سیلاب کے نقصانات سے بچانے کے لیے نجی بند باندھ رکھے ہیں جس سے دریا کے قدرتی بہاؤ میں شدید رکاوٹ پیدا ہوگئی ہے[6]۔

کچے کے علاقوں میں 2010ء کے سیلاب نے شدید تباہی مچائی۔ علاقے میں رہنے والے 35 لاکھ لوگ بے گھر ہوئے جب کہ دس لاکھ ایکڑ اراضی پر تیار فصلیں تباہ ہوگئی تھیں۔ دنیا کے کسی بھی دریا کے ساتھ واقع کچے کے علاقوں میں لوگوں کو مستقل طور پر رہنے کی اجازت نہیں ہوتی، لیکن دریائے سندھ کے آس پاس 35 لاکھ لوگ اس وقت بھی رہائش پذیر ہیں[7]۔ 2010ء کے سیلاب میں اربوں روپے کا نقصان ہوا اور ہزاروں کی تعداد میں گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ ان دیہات میں رہنے والوں کی بڑی تعداد چھوٹے کاشتکاروں اور بے زمین کسانوں پر مشتمل تھی جو سیلاب کے دوران بے سروسامانی کے عالم میں اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ حفاظتی پشتوں پر بے سہارا بیٹھے رہے۔ اِن میں زیادہ تعداد اُن کسانوں کی تھی جن کے پاس سر چُھپانے کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے زمینداروں کے مقروض تھے۔ سیلاب نے انہیں مزید مقروض کر دیا تھا۔ سندھ کے زمینداروں میں یہ رواج پایا جاتا ہے کہ اگر کسان کسی زمیندار کا مقروض ہو تو اُسے کوئی دوسرا زمیندار اپنی زمین کاشتکاری کے لیے نہیں دیتا کیونکہ اس عمل سے زمینداروں کے درمیان جھگڑوں کا خدشہ ہوتا ہے لہذا فساد کے خدشات اور مفادات کے ٹکراؤ سے بچاؤ کے لیے قربانی غریب اور بے زمین کسانوں کو ہی دینی پڑتی ہے۔ چنانچہ کچے کے کسانوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارا نہیں رہتا کہ پانی کی سطح کم ہوجانے پر وہ دوبارہ کچے کے علاقے میں واپس جائیں۔ کچے کی زمین اور جنگلات کی حفاظت محکمۂ جنگلات اور محکمۂ آبپاشی کا فرض ہے، لیکن گزشتہ چند دہائیوں سے یہ محکمے اپنے فرائض مکمل طور پر نہیں نبھا رہے، جس کی وجہ سے دریا کا قدرتی نظام (ایکوسسٹم) اور دریائی جنگلات شدید متاثر ہوئے ہیں۔

دریائے سندھ میں پانی کے بہاؤ اور کچے کی آبادی میں اضافے کا باہمی تعلق

کچے کی آبادی میں گزشتہ دس سے پندرہ برسوں کے دوران تیزی کے ساتھ ہونے والے اضافے کی وجوہ کو سمجھنے کے لیے دریائے سندھ میں پانی کے بہاؤ کا ایک مختصر تاریخی جائزہ لینا ضروری ہے۔

پاکستان میں بارشوں کا موسم عموماً جون کی پندرہ تاریخ سے شروع ہوتا ہے اور اگست کے مہینے تک جاری رہتا ہے۔کبھی کبھار شدید بارشیں ہوتی ہیں جو ہمالیہ، قراقرم اور ہندوکش کے پہاڑوں پر موجود برف کے پگھلنے کا سبب بنتی ہیں اور یہ پانی نالوں اور دریاؤں سے گزرتا ہوا دریائے سندھ میں داخل ہوتا ہے جس کی وجہ سے عام طور پر اگست سے اکتوبر تک دریائے سندھ میں پانی کی سطح میں اچھا خاصا اضافہ ہوجاتا ہے۔ بہت زیادہ بارشیں ہونے کی وجہ سے دریا میں سیلاب بھی آجاتا ہے جو پیٹ میں آنے والی ہر چیز اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔

ماہرینِ آب پاشی دریائے سندھ میں آنے والے پانی کی تین حصوں میں درجہ بندی کرتے ہیں۔ دریا کا بہاؤ جب پچاس ہزار اور ایک لاکھ کیوسک کے درمیان ہوتا ہے تو اُسے عام بہاؤ کہا جاتا ہے جس میں کچے کے علاقے محفوظ رہتے ہیں۔ پانی کی مقدار ایک سے دو لاکھ کیوسک کے درمیان ہو تو کچے کے دس فی صد حصے میں پانی آجاتا ہے لیکن کسی قسم کا مالی نقصان نہیں ہوتا۔ دو سے تین لاکھ کیوسک پانی کچے کے بیس فی صد علاقے کو متاثر کرتا ہے

جس سے کسی حد تک فصلوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ پانی کی مقدار چار لاکھ کیوسک ہوجانے پر کچے کا 35 سے 40 فی صد حصہ زیرِ آب آجاتا ہے جس سے فصلوں اور گھروں کو شدید نقصان پہنچتا ہے اور متاثرہ آبادی دریا کے حفاظتی پُشتوں پر منتقل ہوجاتی ہے۔ پانی کی مقدار پانچ لاکھ کیوسک سے بڑھ جانے پر کچّے کا ساٹھ سے ستّر فی صد علاقہ زیرِ آب آجاتا ہے اور سات لاکھ کیوسک سے زائد ہونے پر نوّے فی صد یا تمام علاقہ پانی میں ڈوب جاتا ہے جس سے گھر اور کھڑی فصلیں تباہ ہوجاتی ہیں۔ ایسی صورتحال میں محکمۂ آب پاشی کے عملے کو ہنگامی طور پر بُلایا جاتا ہے کیوں کہ حفاظتی پُشتوں پر پانی کا شدید دباؤ ہوتا ہے[8]۔

جدول-1: 1997ء سے 2004ء کے دوران گدو بیراج سے کوٹری تک پانی کا بہاؤ

سیلاب کی نوعیت	زیرِ آب آنے کی سطح	رونما ہونے والے واقعات		
		گدو	سکھر	کوٹری
عمومی	سکھر سے بھی پہلے نچلی سطح پر	7	6	1
نچلی	بیس فی صد	3	2	0
درمیانی		4	1	0
زیادہ	چالیس فی صد	0	0	0
انتہائی شدید (سُپر)	پچھتر فی صد	0	0	0
	پچھتر فی صد سے زائد			

Study of Riverine forest upstream Sukkur and downstream Kotri - 2008[9]

1991ء میں پانی کی تقسیم کے بین الصوبائی معاہدے (Water Apportionment Accord-1991) کے بعد دریائے سندھ میں پانی کی سطح میں کمی واقع ہوئی جس سے گدو سے ڈیلٹا تک دریائی جنگلات کو نقصان پہنچا اور ان کا رقبہ کم ہوگیا۔ اس کے اثرات سندھ کی

زرعی آبادی میں بھی نقصان کا سبب بنے۔

گزشتہ سات برس کے دوران گدو کے مقام پر پانی کا بہاؤ بالکل معمولی رہا ہے جب کہ سکھر اور کوٹری کے مقام پر تو نچلی سطح کا بہاؤ بھی نہیں رہا جس کی وجہ سے دریائی جنگلات سکڑتے چلے گئے۔

صوبائی محکمۂ جنگلات نے دریائی جنگلات کے رقبے میں اضافے کے لیے ایگرو فاریسٹ لیز پالیسی 2004ء متعارف کرائی۔ اس پالیسی کی تحت کچے کی ہزاروں ایکڑ زمین پٹے (لیز) پر دے دی گئی۔ پالیسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہزاروں افراد نے لیز حاصل کر لی اور یوں کچے کے علاقے میں آبادی بڑھتی چلی گئی۔

کچے کے علاقے میں تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے اہم اسباب میں غربت، بے روزگاری، تعلیم کی کمی اور سندھ میں زرعی پانی کی کمی شامل ہیں۔تعلیم کی کمی کی وجہ سے دیہاتوں سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کی بڑی تعداد کھیتی باڑی اور مال مویشی پالنے کے کام کی طرف مائل ہورہی ہے کیوں کہ نقد رقم نہ ہونے کی وجہ سے وہ کوئی کاروبار بھی نہیں کر سکتے[10]۔ دوسری جانب دریائے سندھ میں پانی کی کمی کی وجہ سے خاص طور پر بدین، ٹھٹھہ، عمرکوٹ اور میرپور خاص کے اضلاع میں زراعت سے وابستہ خاندان بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ان علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ فصلوں کی کٹائی کے وقت مزدوری کے لیے عارضی طور پر بیراج کے اطراف کے علاقوں کا رُخ کر لیتے ہیں۔ان میں سے کچھ تو کام ختم کرنے کے بعد واپس چلے جاتے جب کہ کچھ وہیں مستقل رہائش اختیار کر لیتے ہیں اور مقامی افراد سے کم اجرت پر کام کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ اس سے مقامی لوگوں کے لیے روزگار کا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے۔

پانی کی کمی کے پیشِ نظر دس سے بیس ایکڑ کی ملکیت رکھنے والے چھوٹے کاشت کار شراکتی بنیادوں پر کاشت کاری کے بجائے عموماً روزانہ اجرت کی بنیاد پر مزدوروں کی خدمات حاصل

کر لیتے ہیں۔ اس بنا پر سندھ کے دیہی علاقوں کے بے زمین کسانوں میں غربت اور بے روزگاری کی شرح میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔صوبے میں 75 فی صد دیہی آبادی کا تعلق زراعت کے پیشے سے ہے جو کھیتی باڑی کے ساتھ مال مویشی بھی پالتی ہے۔ یوں اگر انہیں فصلوں سے نقصان ہو جائے تو مویشی بیچ کر گھر کے اخراجات پورے کرتے ہیں لیکن گزشتہ بیس برسوں کے دوران پانی کی کمی کی وجہ سے اچھی پیداوار ممکن نہیں رہی لہٰذا بے زمین کسان اندرونِ سندھ روزگار کی تلاش میں جگہ جگہ پھرتے رہے اور یوں کچے کی آبادی بھی بڑھتی چلی گئی۔

کچے کے باشندوں کے حالات

کچے کے لوگ صدیوں سے مال مویشی پالنے کا کام کرتے آ رہے ہیں۔محض چند سال پہلے تک کچے کے لوگ کافی خوشحال زندگی بسر کرتے تھے کیوں کہ ان کے پاس بڑی تعداد میں مویشی ہوتے تھے جن سے خاصی مقدار میں دودھ حاصل ہوتا تھا۔ مقامی رواج کے مطابق دودھ کو فروخت کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا، لہٰذا ان کی عورتیں دودھ سے مکھن اور گھی نکال کر قریبی شہروں میں فروخت کر کے گھر کے اخراجات چلاتی تھیں۔ گھر کے مرد گھنے جنگلات سے شہد اور دیگر قیمتی اشیاٗ حاصل کر کے شہروں میں فروخت کرتے تھے۔ جنگلات نہ صرف ان کے مویشیوں کے لیے چارہ فراہم کرتے تھے بلکہ آمدنی کا بھی ذریعہ تھے۔ کچے کے علاقوں میں امن امان کا کوئی مسئلہ نہیں تھا اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ دوسرے کی چیز کو ہاتھ لگائے۔

کچے کے علاقے کی زمین پٹے پر دینے کے رجحان نے مقامی آبادی کی سماجی اور اقتصادی زندگی کو بے انتہا متاثر کیا۔جنگلات کی کٹائی کی وجہ سے مویشیوں کے چارے کا انتظام مشکل تر ہوتا گیا چنانچہ آہستہ آہستہ انہوں نے سارے مویشی بیچ دیے۔ کچے کی زمین لیز پر حاصل کرنے والوں کی اکثریت اثر ورسوخ کے حامل سیاسی افراد کی ہے جنہوں نے کچے کو آباد کرنے کے لیے بے زمین کسانوں کو پکے علاقوں سے لا کر کچے میں آباد کیا۔ان افراد نے ہی

غیر قانونی طور پر درختوں کی کٹائی کی۔ آبادی میں اضافے سے جنگلات کو نقصان پہنچا اور مقامی لوگوں کے لیے سماجی مسائل بھی پیدا ہوگئے۔ اس صورت حال میں کچے کی مقامی آبادی نے بھی کاشت کاری شروع کردی جب کہ باقی آبادی روزگار کے لیے شہروں کو کُوچ کرگئی۔

سندھ کے مختلف اضلاع میں کچے کی زمین کی لیز اور قبضہ

دریائے سندھ، صوبۂ سندھ کی اسّی فی صد دیہی آبادی کے لیے روزگار کا ذریعہ ہے، جو دریائے سندھ کے پانی سے اپنی زمینوں کو سیراب کرتی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پورے ملک کی خوراک اسی دریا کے پانی سے اُگائی جاتی ہے اور یوں ملک کی زرعی معیشت کا انحصار بھی دریائے سندھ کے پانی پر ہے۔ دریائے سندھ، سندھ کے چودہ اضلاع سے گزرتا ہوا سمندر میں گرتا ہے۔ ان اضلاع میں کشمور، شکارپور، لاڑکانہ، نوشہرو فیروز، دادو، گھوٹکی، سکھر، خیرپور، شہید بینظیر آباد، مٹیاری، حیدرآباد، ٹنڈو محمد خان اور ٹھٹھہ شامل ہیں۔ ضلع کشمور سندھ اور پنجاب کے سرحدی علاقے پر واقع ہے اور دریائے سندھ، پنجاب سے براستہ کشمور صوبۂ سندھ میں داخل ہوتا ہے۔

کشمور میں کچے کی کُل اراضی سات لاکھ 36 ہزار چارسو اٹھائیس ایکڑ ہے، جس میں سے سات لاکھ چوبیس ہزار چھ سو سترہ ایکڑ اراضی پر قانونی چارہ جوئی چل رہی ہے کیونکہ قابضین ان زمینوں کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں[11]۔ کشمور میں کچے کی زمین کا کچھ حصہ لیز پر لیا گیا ہے جب کہ باقی تمام پر قبضہ کرلیا گیا۔

ضلع شکارپور میں کچے کا بہت کم حصہ آتا ہے۔ محکمہ ریونیو کے اعداد شمار کے مطابق شکارپور میں کچے کی سترہ ہزار 383 ایکڑ زمین واقع ہے[12]۔

ضلع لاڑکانہ میں کچے کا کافی علاقہ آتا ہے جو دو لاکھ 56 ہزار آٹھ سو بارہ ایکڑ اراضی پر مشتمل

ہے۔ اس میں سے دو لاکھ 54ہزار پانچ سو ایکڑ پر قانونی چارہ جوئی چل رہی ہے جس پر مقامی سردار، وڈیرے اور بااثر لوگ قابض ہیں[13]۔

بورڈ آف ریونیو سندھ نے ضلع دادو میں کچے کی کوئی زمین ظاہر نہیں کی، لیکن مقامی اخبارات کی رپورٹوں کے مطابق ضلعے میں کچے کی زمین موجود ہے جس میں ایک لاکھ پندرہ ہزار 141 ایکڑ اراضی محکمۂ جنگلات کی ملکیت ہے جس میں سے دس ہزار آٹھ سو 87ایکڑ مقامی سردار کو الاٹ کردی گئی ہے[14]۔ اسی طرح ضلع خیر پور میں دو لاکھ سترہ ہزار آٹھ سو34ایکڑ اراضی میں سے ایک لاکھ ستانوے ہزار سات سو اکتیس ایکڑ پر قانونی چارہ جوئی جاری ہے۔ اس میں سے بھی کچھ اراضی لیز پر لی گئی تھی جب کہ باقی پرسرداروں،وڈیروں اور سیاسی اثر ورسوخ کے حامل افراد کا قبضہ ہے۔

ضلع ٹھٹھہ میں ڈیلٹا بھی واقع ہے جہاں دریائے سندھ سمندر میں داخل ہوتا ہے۔محکمہ ریونیو کے مطابق ٹھٹھہ میں دو لاکھ 29ہزار 167ایکڑ کچے کی زمین موجود ہے جس میں سے ایک لاکھ 91 ہزار چھ سو137ایکڑ پر غیر قانونی قبضہ ہے لہٰذا اس پر قانونی چارہ جوئی جاری ہے۔نوشہروفیروز میں دس ہزار 775ایکڑ کچے کی زمین ہے جس میں سے دو ہزار اٹھارہ ایکڑ محکمۂ جنگلات کے زیرِ قبضہ ہے جب کہ 1766ایکڑ پر قابضین کے خلاف قانونی چارہ جوئی جاری ہے[15]۔

ضلع شہید بے نظیرآباد اور حیدرآباد ڈویژن میں تقریباچار لاکھ چالیس ہزار چارسو 91 ایکڑ کچے کی زمین ہے جس میں سے 0.722فی صد پر جنگلات ہیں، 58.23ایکڑ پر کاشت کاری ہوتی ہے جب کہ 37.18فی صد بارانی زمین ہے[16]۔ بارانی زمین پرصرف برسات کے موسم میں ہی کام کرنا ممکن ہوتا ہے تاہم گزشتہ دو تین برسوں کے دوران نجی ٹیوب ویل لگا کر بارانی زمین کو سیراب کیا جارہا ہے۔محکمۂ ریونیو کے مطابق صرف بے نظیرآباد میں تین لاکھ چالیس ہزارنو سو ایکڑ اراضی مختلف لوگوں کو لیز پر دی گئی ہے جبکہ محکمۂ ریونیو کے اعداد وشمار

کے مطابق جامشورو، حیدرآباد ، گھوٹکی، سکھر اور ٹنڈو محمد خان اضلاع میں کچے کی زمین پر کہیں بھی قبضہ یا قانونی چارہ جوئی جیسے معاملات نہیں ہیں۔ ان اضلاع میں چھ ہزار دوسو بتیس ایکڑ کچے کی زمین سرکاری ملکیت میں ظاہر کی گئی ہے جبکہ ایک ہزار تین سو چھتیس ایکڑ اراضی پر دریائی جنگلات دکھائے گئے ہیں[17]۔ محکمۂ ریونیو اور محکمۂ جنگلات کی پالیسیوں نے گزشتہ دو دہائیوں میں دریائی جنگلات کو تباہ کر دیا ہے۔ انہی پالیسیوں کی وجہ سے کچے کی ہزاروں ایکڑ زمین پر قبضہ مافیہ قابض ہے۔

محکمہ رُیونیو کے اعداد وشمار کے مطابق اس وقت کچے کی سترہ لاکھ چھیاسی ہزار سولہ ایکڑ اراضی، مختلف سیاسی شخصیات، سرداروں اور بااثر لوگوں کے زیرِ استعمال ہے جنہوں نے وہاں درخت کاٹ کر جنگلات کو ختم کر دیا۔ لکڑیاں اٹھانے کے لیے بھاری ٹرک اور ٹریکٹر ٹرالیاں استعمال کیں جن کی مسلسل آمدورفت سے دریا کے حفاظتی پشتے کمزور پڑ گئے۔ 2010ء کے سیلاب کے وقت دریا کے پشتوں کے متعدد مقامات کی نشاندہی کی گئی جو بہت کمزور تھے۔

کچے کی زمین کی غیر قانونی لیزنگ

محکمۂ ریونیو نے لینڈ گرانٹ پالیسی کی تحت غیر قانونی طور پر کچے کی ہزاروں ایکڑ زمین سیاسی اثر ورسوخ کے حامل جاگیردار وں اور عام آبادگاروں میں تقسیم کر دی جب کہ وہ زمین محکمۂ جنگلات کی ملکیت ہے جو اُنہیں گزشتہ پچیس سالوں سے جنگلات اگانے کے لیے استعمال کرتا آیا ہے۔ گزشتہ دو دہائیوں کے دوران دریا میں پانی کی کمی کی وجہ سے ان زمینوں پر بھی آبادگاری ممکن نہ رہی چنانچہ کچے کی یہ زمین خالی پڑی رہی۔ محکمۂ جنگلات کی دس ہزار ہیکٹر زمین محکمۂ ریونیو کی جانب سے مختلف لوگوں کو الاٹ کر دی گئی[18]۔ محکمۂ ریونیو کی اس روش کی وجہ سے قبضہ مافیا کچے کے علاقے میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئی جنہوں نے زرخیز زمین پر قبضہ کر لیا اور دریا کے قدرتی بہاؤ کی راہ میں بڑی رکاوٹیں پیدا کر دیں۔

کچے پر قبضے کے سماجی اثرات

کچے کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی مقامی لوگوں کے لیے سماجی مسائل کا باعث بن رہی ہے اور یہاں امن و امان کے مسائل بھی پیدا ہورہے ہیں۔ اس کا سب سے اہم سبب یہ ہے کہ نئے آنے والے لوگوں کو سیاسی اثر ورسوخ رکھنے والے ان افرادکی سرپرستی حاصل ہے جنہوں نے انہیں کچے میں لاکر آباد کیا ہے۔ ان طاقت ور افراد نے نئے بسائے گئے لوگوں کی مدد سے کچے کی باقی ماندہ زمین پر بھی قبضہ کرلیا ہے جس کی وجہ سے کچے میں آباد مختلف قبائل کے درمیان خونی تصادم کا آغاز ہوا جس نے سرداری نظام کو مضبوط اور قبائل کے درمیان دشمنیاں پیدا کردیں۔ ان جھگڑوں میں قبائل کو جانی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔

تین سال قبل ٹیاری کے علاقے میں کچے کی زمین پر ہالا کی بااثر شخصیت مخدوم فضل حسین اور سولنگی قبیلے کے درمیان ہونے والے تصادم میں سولنگی قبیلے کا ایک فرد مارا گیا۔ بعد ازاں پنچایت نے فیصلہ کرتے ہوئے زمین کو دونوں فریقین کے درمیان برابر تقسیم کردیا جب کہ ہلاک ہونے والے شخص کے ورثاء کو زرِتلافی ادا کیا گیا[19]۔

ایسا ہی ایک واقعہ ہالا کے قریب رونما ہوا۔ یہ تصادم کھوسہ اور سولنگی قبیلے کے درمیان ہوا جس میں دونوں قبائل کے دس سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے ۔ یہ جھگڑا دو تین سال تک جاری رہا جس کے بعد جرگے کے ذریعے دونوں قبائل کے درمیان صلح کرائی گئی۔ کچھ سال قبل پیر پگارا اور کھوڑو قبیلے کے درمیان بھی کچے کی اراضی پر تنازع شروع ہوا تھا جس نے بعد میں خطرناک شکل اختیار کرلی اور پیر پگارا کے دو لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہ خونی تنازعہ سابق وزیراعظم میر ظفراللہ جمالی کی مداخلت پر ختم ہوا جنہوں نے جرگے کے ذریعے کھوڑو قبیلے پر پانچ کروڑ روپے جرمانہ عائد کرتے ہوئے تنازع کا باعث بننے والی زمین کھوڑو کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا[20]۔

پالیسی سازی اور دریائی جنگلات

کسی ریاست یا ادارے کی ترقی ،خوشحالی اور اسے خودکفیل بنانے میں پالیسیوں کا کردار خاصا اہم ہوتا ہے۔ انہی پالیسیوں پر عمل درآمد کے ذریعے حکومتیں، اداروں اور اقوام کو ترقی کی جانب گامزن کرتی ہیں۔قیامِ پاکستان کے بعد ریاست کو درپیش دشواریوں میں قومی اداروں کے لیے پالیسی سازی بھی شامل تھی۔ اُس زمانے میں محکمۂ جنگلات اس لیے بھی زیادہ اہمیت رکھتا تھا کہ ریلوے لائنوں کے لیے لکڑیوں اور انجن کے لیے کوئلے کی فراہمی اسی محکمے کی ذمے داری تھی۔ جنگلات میں اضافے اور ملک کی لکڑی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے محکمۂ جنگلات نے 1955ء میں پالیسی متعارف کروائی تاہم اس سے دریائی جنگلات کو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچا[21]۔ اُس وقت کچے کے علاقے کی آبادی بھی کم تھی اور وہاں کے باسیوں کے روزگار کا انحصار مویشیوں پر تھا۔ یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اُس زمانے میں محکمۂ جنگلات کی اجازت کے بغیر کوئی شخص درخت نہیں کاٹ سکتا تھا۔ چونکہ کچے میں کاشتکاری کی اجازت نہیں تھی لہٰذا وہاں سے کچھ لوگ فصلوں کی کٹائی کے وقت دوسرے علاقوں میں جا کر مزدوری کرتے اور پورے سال کا اناج اکٹھا کر کے کچے کی طرف واپس آجاتے تھے۔ اس پالیسی کی ناکامی کی ذمے داری محکمۂ جنگلات کے افسران پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں تساہل برتا۔1958ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد ملکی پالیسیوں کا ازسرِنو جائزہ لیا گیا اور 1962ء میں جنگلات کے حوالے سے نئی پالیسی تشکیل دے دی گئی۔

جنگلات پالیسی 1962ء

1962ء کی پالیسی کے تحت جنگلات کو تجارتی حیثیت دے کر ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا گیا۔ پالیسی میں یہ شق شامل کی گئی کہ جنگلات میں صرف ایسے درخت اُگائے جائیں جن سے حاصل ہونے والی لکڑی کی ملک میں ضرورت ہو، اور صرف ایسے درختوں کو ترجیح دی جائے جو کم سے کم وقت میں تیار ہوجائیں۔ اس دور میں کچے کے پرانے درختوں کو کاٹنے کا عمل شروع ہوا اور کچے کے علاقے کے ان لوگوں کو فائدہ پہنچا جو جنگلات کاٹنے کا کام کیا کرتے تھے۔ درخت کاٹنے سے ان کے مویشیوں کے لیے چارے کا بندوبست ہوجاتا تھا اور آمدنی بھی حاصل ہوتی تھی۔ اس پالیسی کے تحت خود حکومت کی جانب سے جنگلات کو کاٹا گیا تاہم جس مقدار میں جنگلات کے رقبے میں اضافے کا کام ہونا چاہیے تھا، وہ نہ ہوسکا۔ اس پالیسی کے تحت محکمۂ جنگلات کی جانب سے پہلی بار جنگل میں کٹائی کی اجازت دی گئی تھی اور جنگلات کی غیر قانونی کٹائی کا آغاز بھی اس پالیسی کے نفاذ کے ساتھ شروع ہوا۔

1975ء کی جنگلات پالیسی

1971ء میں مشرقی پاکستان کے الگ ہوجانے کے بعد باقی ماندہ ملک میں جمہوری حکومت وجود میں آئی جس نے اقتدار سنبھالتے ہی ملکی پالیسیوں کا جائزہ لیا۔ یوں محکمۂ جنگلات کے لیے 1975 میں ایک پالیسی سامنے آئی ۔ یہ پہلی ایسی پالیسی تھی جس میں جنگلات اور ماحولیات کو تحفظ دینے کے لیے سرکاری وغیر سرکاری اداروں کے اشتراک پر زور دیا گیا تھا۔ اس پالیسی کا اصل مقصد ایسے منصوبوں کا فروغ تھا جن کے ذریعے محکمۂ جنگلات کو خودکفیل بنایا جاسکے چنانچہ گزارا اور تونگیا جیسے منصوبوں کا آغاز کیا گیا[22]۔

تونگیا منصوبے کے تحت دو یا تین برس کے لیے محکمۂ جنگلات کی زمین، مقامی اور چھوٹے

آبادگاروں کو مختلف شرائط پر لیز پر دی گئی۔شرائط کے مطابق آبادگار کے لیے لازم قرار دیا گیا کہ وہ مقررہ حدود میں ایک سال کے اندر نئے درخت اگائیں گے ۔ پانی کی کمی کی صورت میں آبادگاروں کو نجی ٹیوب ویل لگانے کی اجازت بھی دی گئی۔اس طرح حکومت نے کچے کی حدود میں پانچ ہزار ٹیوب ویل لگانے کی منظوری دے دی۔محکمۂ جنگلات کے افسران کو ذمے داری دی گئی کہ وہ لیز شدہ زمین کا معائنہ کرتے رہیں گے۔افسران کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ لیز کی شرائط کی خلاف ورزی کی صورت میں لیز منسوخ کردی جائے[23]۔

یہ پالیسی جنگلات کے لیے خاصی بہتر ثابت ہوئی کیوں کہ اس کے ذریعے پانی کی کمی والے علاقوں میں بھی درخت اگائے گئے لیکن کچھ عرصے کے بعد آبادگاروں نے شرائط پر عملدرآمد کرنا چھوڑ دیا اور بااثر افراد نے زمینوں پر قبضے شروع کردیے۔حکومت نے ساری صورتحال کو دیکھتے ہوئے لیز پر پابندی عائد کردی۔

جنگلات پالیسی 1980ء

1977ء میں منتخب حکومت کا تختہ اُلٹے جانے کے بعد نئی فوجی حکومت نے پالیسیوں کا ازسرِنو جائزہ لیا اور 1980ء میں جنگلات کے حوالے سے نئی پالیسی متعارف کروائی گئی۔اس پالیسی کے تحت محکمۂ جنگلات کی زمین پانچ سال کے لیے لیز پر دی گئی۔آبادگار پہلے تین برس تک لیز کی رقم دینے کے پابند نہیں تھے جبکہ تین سال بعد 150 روپیہ فی ایکڑ کی شرح سے ادائیگی لازمی تھی۔اس پالیسی میں آبادگار کسی خاص قسم کے درخت اگانے کے پابند نہیں تھے۔

اس پالیسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں کی بڑی تعداد نے کچے کی زمین لیز پر حاصل کرلی جن میں بہت سے جاگیردار اور بااثر افراد بھی شامل تھے۔ان لوگوں نے لیز کی نرم شرائط سے فائدہ اٹھاکر کچے کی زمین پر قبضہ کرلیا اور پالیسی میں درج پابندیوں کے سبب محکمۂ جنگلات کے افسران اس سلسلے کو روکنے میں ناکام رہے۔اس پالیسی نے دریائی جنگلات کو بہت نقصان پہنچایا۔

لیز پالیسی 1991ء

اس پالیسی کے تحت لیز پر دی جانے والی زمین کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلا حصہ ان علاقوں پر مشتمل تھا جنہیں مقامی زبان میں ''ڈورا'' کہا جاتا ہے۔ یہ ایسے نشیبی علاقے ہوتے ہیں جو دریا میں زیادہ پانی آجانے کی صورت میں بھر جاتے ہیں اور خشک ہونے میں وقت لیتے ہیں۔ دوسرا حصہ اُن علاقوں پر مشتمل تھا جو مقامی زبان میں ''کسیاں'' کہلاتے ہیں اور یہ دریا کی ذیلی شاخوں (چینلز) سے نکلتے ہیں۔ ان دو قسم کے علاقوں کے علاوہ کچے کی باقی زمین بھی لیز پر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

اس پالیسی میں بھی نئے درخت اُگانے کی کوئی شرط شامل نہ تھی ۔ ایک بار پھر اثر ورسوخ رکھنے والے افراد نے ہزاروں ایکڑ کچے کی زمین لیز پر حاصل کر کے باقی زمینوں پر قبضہ کرلیا، نتیجتاً حکومت نے کچے کی زمین کی لیزنگ پر ایک بار پھر پابندی عائد کردی۔

پابندی عائد کیے جانے کے باوجود حکومت کچے کی زمین پر قبضے ختم نہیں کراسکی اور یہ زمین قانونی چارہ جوئی کی نظر ہوگئی۔ اس پالیسی کے تحت لیز لینے والوں میں جاگیرداروں اور سیاسی اثر ورسوخ رکھنے والوں کی اکثریت تھی جو پابندی کے بعد بھی کچے کی زمین پر لوگوں کو آباد کرنے کے ساتھ درختوں کی کٹائی اور زمینوں پر قبضے کرتے رہے۔

ایگرو فاریسٹ لیز پالیسی 2004ء

1999ء میں منتخب حکومت کے خاتمے کے بعد کچے کی زمین پر قبضے اور درختوں کی غیر قانونی کٹائی میں تیزی آگئی، یہ سلسلہ 2001ء تک جاری رہا جس کے بعد فوجی حکومت نے قبضہ ختم کرانے کی کوشش کی تاہم کچھ وقت بعد قابضین چھڑائی گئی زمین پر دوبارہ قابض ہوگئے۔ صورت حال میں بہتری کے لیے حکومت نے ایگرو فاریسٹ لیز پالیسی 2004ء متعارف کرائی۔ اس پالیسی کے تحت حکومت نے 53 ہزار 200 ہیکٹرز زمین کو پانچ سالہ لیز پر دینے

کی سفارش کی۔ایک فرد کو صرف چالیس ایکڑ زمین دینے کی سفارش کی گئی جس میں سے پچیس فی صد پر نئے درخت کاشت کرنے کا پابند کیا گیا جب کہ لیز پالیسی پر مکمل عملدرآمد کی صورت میں لیز کی مدت میں پانچ سال کے اضافے کی سہولت بھی فراہم کی گئی۔

اس پالیسی سے دریائی جنگلات کو کچھ خاص فائدہ نہ ہوسکا اور حکومت صرف سولہ ہزار ہیکٹرز اراضی ہی لیز پر دینے میں کام یاب ہوسکی، بقیہ زمین پر اب بھی بااثر افراد کا قبضہ ہے۔ چھوٹے آبادگار لیز حاصل کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ پیش کی جانے والی زمینوں پر اب بھی بااثر افراد کا قبضہ ہے۔

سیٹلائٹ تصاویر کے مطابق حیدرآباد اور نواب شاہ میں کچے کی صورت حال

قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک جنگلات کے تحفظ کے لیے سات پالیسیاں بنائی گئیں تاہم اس سے صورت حال میں کوئی بہتری نہ آسکی۔ آیئے، ان پالیسیوں کے پسِ منظر میں نواب شاہ اور حیدرآباد ڈویژنز میں واقع کچے کے جنگلات کی صورتِ حال کا تکنیکی بنیادوں پر جائزہ لیتے ہیں۔

نواب شاہ اور حیدرآباد ڈویژنز میں دریائے سندھ کے دونوں پشتوں کے درمیان کچے کی چار لاکھ چالیس ہزار 491 ایکڑ سے زائد اراضی واقع ہے[24]۔ لینڈ یوز / لینڈ کور ریموٹ سینسنگ ٹیکنولوجی (Land use/ Land Cover Remote Sensing Technology) کی مدد سے لی گئی تصویروں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ پچھلے ادوار میں کچے کی زمین کا زرعی مقاصد کے لیے بہت کم استعمال ہوتا تھا جس کے اسباب میں کچے کی کم آبادی اور وہاں مویشی پالنے کا رجحان شامل ہیں۔ کاشت کاری کے آثار صرف حفاظتی پشتوں کے قریب واقع علاقوں میں ہی پائے جاتے ہیں۔مواصلاتی سیارے سے لی گئی تصویر سے پتہ چلتا ہے کہ 1979ء میں کچے کی زمین کا صرف 10.56 فی صد حصہ زرعی استعمال میں لایا جاتا تھا، 42.69 فی صد پر جنگلات تھے جب کہ 28.39 فی صد زمین غیر آباد تھی۔تصویریں اپریل

کے مہینے میں لی گئی تھیں اور چوں کہ اپریل میں فصلوں کی کٹائی ہوجاتی ہے اس لیے عین ممکن ہے کہ زرعی استعمال میں آنے والی زمین کم دکھائی دے رہی ہو۔ بہرحال اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ستّر کے عشرے میں کچے کے علاقے میں زراعت کافی کم کی جاتی تھی اور چونکہ آبادی کی اکثریت مویشی پالتی تھی اور کاشت کاری سے منسلک آبادی بہت کم تھی لہذا وہاں زمینوں پر قبضے کے معاملات بھی کم تھے۔

1980ء کی جنگلات پالیسی کے بعد کچے کی صورتحال

اس پالیسی کے تحت لیز حاصل کرنے والوں کو کافی چھوٹ دی گئی۔ پانچ سے چھ سال کے عرصے کی لیز پر، پہلے تین سال تک لیز کی رقم کی ادائیگی معاف کردی گئی۔ لیز کی رقم صرف ڈیڑھ سو روپے فی ایکڑ مقرر کی گئی اور لیز حاصل کرنے والوں پر کسی مخصوص درخت کی کاشت کی شرط بھی عائد نہیں کی گئی۔ پالیسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چھوٹے بڑے آبادگاروں نے ہزاروں ایکڑ کچے کی زمین لیز پر حاصل کرلی۔ اس صورتحال میں آس پاس کے پکے کے علاقوں سے لوگ منتقل ہونا شروع ہوگئے اور یوں کچے کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہوا۔

مواصلاتی سیارے کی مدد سے لی گئی تصویروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیرِتذکرہ عرصے میں جنگلات 42.67فی صد سے کم ہوکر 37.63فی صد رہ گئے اور زرعی اراضی 10.54فی صد سے بڑھ کر 17.11فی صد تک جا پہنچی جب کہ غیر آباد زمین بھی تقریباً آٹھ فی صد اضافے کے ساتھ 36.56فی صد تک پہنچ گئی۔ یہاں غیر آباد اراضی سے مراد وہ زرعی اراضی ہے جہاں سیٹلائٹ تصویر لینے سے پہلے ہی فصل کی کٹائی ہوچکی تھی۔

1991ء کی جنگلات پالیسی کے بعد کچے کی صورتحال

1991ء کی جنگلات پالیسی جمہوری دورِحکومت میں تشکیل دی گئی۔ اس کی تیاری کے دوران

1989ء میں تین روزہ سیمینار منعقد کیا گیا تاکہ ماحولیات کے حوالے سے کام کرنے والی بین الاقوامی تنظیموں سے بھی صلاح مشورہ کیا جاسکے[25]۔ سیمینار میں امریکا، کینیڈا، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ میں کام کرنے والی تنظیموں نے شرکت کی۔ پالیسی سازی کے دوران نہ صرف بین الاقوامی تنظیموں بلکہ مقامی سِول سوسائٹی اور دیہی علاقوں میں کام کرنے والی تنظیموں کو بھی اس عمل میں شرکت کا موقع فراہم کیا گیا۔ پالیسی میں مقامی آبادی کے مفادات کا خیال رکھا گیا اور مخصوص درختوں کی کاشت کی شرط عائد نہیں کی گئی۔ پالیسی کے نفاذ کے بعد جنگلات کا رقبہ مزید کم ہوکر 11.75 فی صد رہ گیا۔ زرعی اراضی بڑھ کر 27.27 فی صد تک جا پہنچی اور غیر آباد زمین کا رقبہ بڑھ کر 48.38 فی صد ہو گیا۔ ان اعداد وشمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس پالیسی کی منظوری کے بعد کچے کے علاقے میں بے دردی کے ساتھ دریائی جنگلات کو ختم کرکے زمین کو زرعی استعمال میں لایا گیا۔

جنرل مشرف کی فوجی حکومت کے ابتدائی دنوں میں محکمۂ جنگلات نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوج کی مدد سے کچے کی زمین پر ہونے والے قبضے ختم کرانے کی کوشش کی۔ فوج محض کچھ دنوں تک ہی ان علاقوں میں کاشت کاری کا سلسلہ روک پائی تاہم قبضے ختم نہ کراسکی۔ 2000ء میں سیٹلائٹ سے لی جانے والی تصویر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دوران دریائی جنگلات کا رقبہ مزید کم ہوکر 9.52 فی صد رہ گیا۔ زرعی اراضی بھی کم ہوکر 23.14 فی صد رہ گئی جب کہ غیر آباد زمین میں بھی کمی واقع ہوئی[26]۔

ایگروفاریسٹ لیز پالیسی 2004ء کے اثرات

کچے کی صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد ایگرو فاریسٹ لیز پالیسی 2004ء تیار کی گئی جس کو صوبائی حکومت کی جانب سے 2005ء میں منظور کیا گیا۔

اس پالیسی میں یہ شرط عائد کی گئی کہ لیز لینے والا فرد زمین کے پچیس فی صد حصے پر ایک سال کے اندر نئے درخت اگائے گا تاہم کاشتکاروں نے اس شرط کو پورا نہیں کیا کیونکہ انہیں نئے

درخت اُگانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دوسری جانب محکمۂ جنگلات نے بھی پالیسی پر عمل درآمد یقینی بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

ایگرو فاریسٹ لیز پالیسی 2004ء نے کچے کے علاقوں پر انتہائی منفی اثرات مرتب کیے۔ جن لوگوں نے فوجی آپریشن کے ڈر سے کچے کی زمین پر کاشتکاری ترک کردی تھی، وہ ایک بار پھر پرانی روش پر واپس آگئے اور رہے سہے درختوں کو بھی کاٹنا شروع کردیا۔ یہ سلسلہ ڈھٹائی کے ساتھ جاری رہا یہاں تک کہ 2010ء کے سیلاب سے پہلے کچے کی زمین زرعی زون میں تبدیل ہوگئی جہاں ہزاروں کی تعداد میں نجی ٹیوب ویل لگا کر کاشت کاری کی جارہی تھی۔

جنوری2010ء میں سیٹلائٹ سے لی گئی تصویر کے مطابق جنگلات 9.52 فی صد سے کم ہوکر 0.722فی صد رہ گئے، زرعی اراضی جو پہلے 23.41فی صد تھی، بڑی تبدیلی کے ساتھ 58.23فی صد تک جا پہنچی جب کہ غیر آباد زمین 57.55 سے گھٹ کر 37.18 فی صد ہو گئی۔ اس جائزے سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دریائے سندھ کے اطراف گزشتہ چند برسوں کے دوران کیا کچھ ہوتا رہا ہے اور ان سرگرمیوں نے دریا کے قدرتی بہاؤ کو کس بری طرح متاثر کیا۔

شہروں اور دیہات کی ترقی میں فرق

آبادی کے لحاظ سے انسانوں کے رہن سہن کو سماجی ماہرین دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں: اوّل شہری آبادی جس میں چھوٹے اور بڑے شہروں میں رہنے والی آبادی شامل ہوتی ہے اور دوم، دیہی آبادی جس میں چھوٹے اور بڑے گاؤں یا جھونپڑیوں میں رہنے والی آبادی شامل ہوتی ہے۔ بعض ترقی یافتہ ممالک میں شہری اور دیہی آبادی کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے: آسٹریلیا میں شہری آبادی سے مراد ایسا علاقہ ہے جہاں کم از کم ایک ہزار خاندان فی مربع کلومیٹر رہائش پذیر ہوں۔ کینیڈا میں چار سو افراد فی مربع کلومیٹر کے حامل علاقے کو شہر مانا جاتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں ایسی آبادیوں کو دیہات کا درجہ دیا جاتا ہے جو شہری آبادی سے کم از کم تین کلومیٹر کے فاصلے پر آباد ہوں[27]۔ صنعتی ممالک یا خدمات کے مستحکم شعبے کے حامل ممالک میں شہری آبادی کی کثرت ہوتی ہے۔ شہری آبادی نئی ٹیکنالوجی تک آسان رسائی کی وجہ سے روزگار کے وسائل خود پیدا کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ اسی طرح زرعی ممالک میں دیہی آبادی کی اکثریت ہوتی ہے جو روزگار کے لیے قدرتی وسائل مثلاً زرعی زمین، پانی، جنگلات اور نہروں وغیرہ پر انحصار کرتی ہے۔

پاکستان بھی زرعی ملک ہے لیکن گزشتہ تیس برس کے سیاسی عدم استحکام نے ملکی معیشت کو بُری طرح متاثر کیا ہے جس کی وجہ سے غربت کی شرح میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ 1987ء میں پاکستان میں غربت کی مجموعی شرح 23 فی صد تھی۔ یہ شرح شہری علاقوں میں 19 فی صد اور دیہی علاقوں میں 26 فی صد تھی۔ 1996ء میں غربت کی شرح بڑھ کر 28 فی صد ہوگئی، جو دیہی علاقوں میں 30 فی صد جب کہ شہری علاقوں میں 25 فی صد تھی۔ 2002ء میں پاکستان

میں غربت کی شرح 33 فی صد تھی جو شہری اور دیہی علاقوں میں بالترتیب تیس اور پینتیس فی صد تھی۔ 2005ء میں اس شرح میں کمی واقع ہوئی جو شہری علاقوں میں 28 جب کہ دیہی علاقوں میں 31 فیصد تھی[28]۔

تین کروڑ چار لاکھ 39 ہزار 893 کی آبادی کے ساتھ صوبۂ سندھ پاکستان کا دوسرا بڑا صوبہ ہے۔ یہاں کی 48 فی صد آبادی شہروں جب کہ 52 فی صد دیہی علاقوں میں رہائش پذیر ہے[29]۔ دیہی آبادی کا 70 فی صد حصہ کھیتی باڑی سے منسلک ہے جب کہ باقی آبادی ذاتی کاروبار یا ملازمت کرتی ہے۔

پاکستان میں زرعی معیشت کی زوال پذیری اور زرعی اصلاحات کے عدم نفاذ کی وجہ سے زرعی وسائل پر اب تک جاگیرداروں کا قبضہ ہے اور یوں زراعت سے وابستہ افراد کی اکثریت غربت کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ صوبۂ سندھ میں روزگار کی صورت حال کا جائزہ لینے سے پہلے اُن اضلاع میں غربت کی شرح کا جائزہ لینا ضروری ہے جہاں سے دریائے سندھ گزرتا ہے۔ ذیل میں سندھ کے ان اضلاع میں غربت کی شرح فیصد میں دکھائی گئی ہے جو دریا کے کنارے آباد ہیں:

اضلاع	غُربت کی شرح (فی صد)
شکار پور	36.2
سکھر	44.4
خیر پور	44.9
لاڑکانہ	37.2
دادو	37.8
نوشہرو فیروز	32.6
نواب شاہ (شہید بے نظیر آباد)	32
ٹھٹھہ	40.7

Source:WFP/SDPI 2003. Food Insecurity in Rural Pakistan

شہری اور دیہی علاقوں میں پائی جانے والی غربت کی شرح میں بہت زیادہ فرق ہے۔ غربت نہ صرف روزگار پر گہرے اثرات چھوڑتی ہے بلکہ انسانی ترقی کے اشاریوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے جس میں صحت، تعلیم، خوراک اور رہن سہن کے اشاریے شامل ہیں۔ شہروں میں دیہی علاقوں سے زیادہ روزگار کے مواقع پائے جاتے ہیں۔ دیہی علاقوں میں رہنے والے زراعت یا مویشی پال کر اپنا روزگار حاصل کرتے ہیں۔ زرعی زمین کو دیہی علاقوں میں اہم ترین ذریعۂ معاش تصور کیا جاتا ہے، تاہم سندھ میں آج بھی مضبوط جاگیرداری نظام کی وجہ سے دیہی آبادی کی اکثریت بے زمین اور بے گھر ہے اور عام آدمی کے لیے روزگار میں اضافے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔صوبے میں وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم اور تعلیم کی کمی کی وجہ سے سندھ کی دیہی آبادی کی اکثریت کھیتی باڑی تک محدود ہے۔

سندھ کی زرعی معیشت کا انحصار دریائے سندھ کے پانی پر ہے۔ زیرِ زمین دستیاب پانی میں سے صرف اٹھائیس فی صد میٹھا یا کاشت کاری کے قابل ہے۔ دریا کا پانی کھیتوں تک نہ پہنچنے سے زمین غیرآباد ہوجاتی ہے۔ ایسی زمین پر سیم وتھور کے اثرات بڑھ جاتے ہیں اور کچھ عرصے کے بعد وہ زمین کاشت کے قابل نہیں رہتی۔ یوں دریا میں پانی کی کمی کا اثر سندھ کی زرعی معیشت پر پڑتا ہے جس کی وجہ سے دیہی علاقوں میں غربت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

شہروں میں روزگار کے مواقع زیادہ ہونے کی وجہ سے وہاں غربت کی شرح دیہی علاقوں کی نسبت خاصی کم ہے۔ روزگار، تعلیم وتربیت، صحت و صفائی اور دیگر خدمات کے مقابلتاً بہتر نظام کی وجہ سے شہری آبادیوں کا معیارِ زندگی بھی دیہی آبادی سے بہتر ہوتا ہے۔ دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کی بڑی تعداد روزگار کی تلاش میں شہری علاقوں کا رُخ کرتی ہے، تاہم تعلیم کی کمی، غیر ہنرمندی اور دیگر عوامل کی بنیاد پر وہ بہتر روزگار کے حصول میں ناکام رہتے ہیں۔

ماہرینِ عمرانیات دیہی علاقوں میں ترقی کی انتہائی سست رفتار کی ذمے داری مختلف عوامل پر ڈالتے ہیں۔اُن کا کہنا ہے کہ دیہی علاقوں میں سیاسی عمل، نظریات کے بجائے طاقت کی بنیاد پر چلتا ہے اور پاکستانی دیہی معاشرے میں جاگیرداری نظام ہی طاقت کی واحد بنیاد ہے چنانچہ عمومی طور پر پاکستانی سیاست، بالخصوص سندھ کی سیاست جاگیرداروں، سرداروں اور دیگر بااثر لوگوں کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ اسمبلیوں میں پہنچنے والے منتخب اراکین بھی یہی سردار اور جاگیردار ہوتے ہیں جو ایسے اقدامات سے گریز کرتے ہیں جن کے نتیجے میں ان کی سیاسی طاقت متاثر ہو، لہٰذا دیہی علاقے ترقی کے سفر میں کہیں پیچھے رہ جاتے ہیں۔دیہی علاقوں میں ترقی صرف اُس وقت ممکن ہے جب زرعی اصلاحات عمل میں آئیں اور ایسی زرعی پالیسیوں کا نفاذ کیا جائے جن کے ذریعے پیداواری لاگت میں کمی آسکے۔

سندھ کی آبی گزرگاہوں کی تاریخ

زمانۂ ماضی سے آج تک دریائے سندھ، مقامی لوگوں کے لیے روزگار کا وسیلہ رہا ہے۔ دریائے سندھ کو بیراجوں اور پشتوں میں قید کرنے سے پہلے بھی پانی مختلف چھوٹی چھوٹی قدرتی نہروں کے ذریعے سندھ کے کونے کونے تک پہنچتا تھا۔ دریائے سندھ کی پہلی قدرتی آبی گزرگاہ علی واہن کے مقام سے نکلتی تھی جو سندھ کے مشرقی حصے کو سیراب کرتی تھی۔

دریائے سندھ کی دوسری آبی گزرگاہ روہڑی کے مقام سے نکلتی تھی جس کو ہاکڑو کے نام سے جانا جاتا ہے[30]۔ جب دریائے سندھ میں زیادہ پانی آتا، تو ہاکڑو مختلف ڈھوروں اور نشیبی علاقے کو سیراب کرتی اور سانگھڑ اور میر پور خاص کے نشیبی علاقوں سے گزرتی ہوئی ڈھورو پران میں گرتی تھی۔ ہاکڑو کلہوڑوں کے دورِ حکومت میں کافی حد تک ختم ہو چکی تھی لیکن اُس کے باوجود روہڑی کے آس پاس کے علاقوں میں اس وقت تک ہاکڑو کا پانی پہنچتا تھا جو وہاں کے نشیبی علاقوں میں پورا سال کھڑا رہتا اور مقامی لوگ اس میں مچھلیاں پکڑ کر روزگار

حاصل کرتے تھے۔

تیسری آبی گزرگاہ نواب شاہ (موجودہ شہید بے نظیرآباد) اور سکرنڈ کے علاقوں کے درمیان سے نکل کر شہداد پور اور ٹنڈو آدم سے گزرتی ہوئی میر واہ گورچانی کے قریب سے گزر کر ڈھورو پران میں داخل ہوتی تھی جو آج بھی سہنی ڈھورو کے نام سے مشہور ہے۔

دریائے سندھ کی چوتھی آبی گزرگاہ مٹیاری کے قرب وجوار سے گزرتی تھی جو 1758ء میں کلہوڑوں کے دورِ حکومت میں ہی ختم ہوگئی تھی۔ یہ گزرگاہ نصرپور سے ٹنڈو غلام علی اور جھڈو کے راستے سمندر میں داخل ہوتی تھی۔

پانچویں قدرتی آبی گزرگاہ کشمور کے مقام سے گزرتی تھی جو سندھو کے نام سے جانی جاتی تھی اس کے آثار آج بھی سندھ ڈھورے کے نام سے پائے جاتے ہیں۔ موجودہ کندھ کوٹ شہر سندھ ڈھورے کے کنارے پر آباد ہے۔ انگریز دورِحکومت میں دریائے سندھ کے پانی کو قابو میں لانے کے لیے 1874ء میں دریائے سندھ پر مٹی کے پشتے (بند) کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا جو بیگاری کینال سے شروع ہوکر کشمور پر ختم ہوا۔ اڑتالیس میل طویل پشتے بننے کے بعد دریائے سندھ کی یہ آبی گزرگاہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

اُس دور میں سندھ کے لوگ اپنی خوراک کی ضروریات پوری کرنے کے لیے موسمِ گرما کے دنوں میں اِن آبی گزرگاہوں سے پانی ہُرلن (نہروں سے پانی نکالنے کا پرانا طریقۂ کار) کے ذریعے نکال کر زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو سیراب کیا کرتے تھے اور سردی کے موسم میں ناروں (زیرِ زمین پانی نکالنے کا پرانا طریقۂ کار) کے ذریعے پانی حاصل کر کے زمینوں کو سیراب کیا کرتے تھے جب کہ عام حالات میں مویشی ہی روزگار کا ذریعہ ہوتے تھے[31]۔

جب دریائے سندھ کے پانی کو پشتے باندھ کر قابو میں لایا گیا تو جن لوگوں کا ذریعۂ معاش

مچھلی اور مویشی تھے، وہ ہجرت کر کے موجودہ دریائے سندھ کے کنارے آباد ہوگئے۔ دریائے سندھ میں مختلف اوقات میں ہونے والی پانی کی کمی کے پیشِ نظر مچھیرے، بیراجوں کے اطراف میں چلے گئے جبکہ باقی ماندہ لوگ دریائے سندھ کے کناروں اور کچے کے علاقوں میں بس گئے جنہیں کچے کی مقامی آبادی میں شمار کیا جاتا ہے۔

2010ء کا سیلاب: اسباب اور نقصانات

1972ء کی مردم شماری کے مطابق کچے کی آبادی ساڑھے سات لاکھ تھی جو آج بڑھ کر 35 لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ اگرچہ دریا کے دونوں اطراف کے کچے کے علاقوں میں آبادی موجود ہے تاہم بائیں کنارے پر کچے کی آبادی زیادہ ہے کیونکہ عام طور پر دائیں کنارے پر پانی کا زیادہ دباؤ رہتا ہے۔ دائیں جانب پانی کی زیادتی کے سبب بائیں جانب کچے کی زمین بھی زیادہ ہے۔ 2010ء کے سیلاب سے پہلے کچے کے دونوں اطراف لاکھوں ایکڑ زمین آباد تھی جس پر کپاس، باجرا، تیلی بیج (سورج مکھی، سرسوں وغیرہ) اور سبزیوں کے کھیت آباد تھے۔

2010ء میں سندھ میں سیلاب کا پانی اگست کے مہینے میں داخل ہوا تھا جب کہ خریف کی فصلیں ستمبر کے پہلے ہفتے میں مارکیٹ میں آتی ہیں چنانچہ سیلاب کی وجہ سے ایک طرف کسانوں کو اربوں روپے کا نقصان ہوا اور دوسری جانب وہ لاکھوں کے مقروض ہو گئے۔

2010ء کے سیلاب کے نتیجے میں کچے کا پورا علاقہ ڈوب گیا اور بعض گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ اکثر کسانوں کے گھر کچی مٹی سے بنے ہوئے تھے لہٰذا وہ بھی سیلاب کی نذر ہو گئے[32]۔ حکومت کی جانب سے کچے کے علاقوں کے لوگوں کو سیلاب کے بعد نقل مکانی میں کوئی مدد نہیں دی گئی چنانچہ مجبور ہو کر لوگوں نے اپنے بل بوتے پر منتقل ہونا شروع کیا اور گاڑیوں کا کرایہ دینے کے لیے لڑکیوں کے زیورات تک بیچنے پر مجبور ہو گئے۔ ان علاقوں

کے مکینوں کے مطابق حکومت کی جانب سے کچے کے علاقوں میں سیلاب یا نقل مکانی کے حوالے سے کسی قسم کی وارننگ بھی جاری نہیں کی گئی، انہیں سیلاب کی اطلاع ریڈیو اور موبائل فون پیغامات کے ذریعے ملی۔

سرکاری امداد

حکومت کی جانب سے 2010ء کے سیلاب زدگان کی مالی امداد کے لیے وطن کارڈ کا اجراء کیا گیا تاہم یہ کارڈ بھی کچے کے اکثر سیلاب زدگان تک نہ پہنچے کیوں کہ اس سے سندھ کے صرف اُن اضلاع کو فائدہ ہوا جو ٹوڑی بند ٹوٹنے کے سبب زیرِ آب آئے تھے۔ یہ تمام اضلاع دریائے سندھ کے دائیں کنارے آباد ہیں۔ بائیں جانب واقع اضلاع کی کچھ یونین کاؤنسل کو متاثرہ قرار دیا گیا تھا تاہم کچے کے متاثرین کی بڑی آبادی، جو دریا کی بائیں جانب آباد ہے اور تعداد کے اعتبار سے دائیں جانب کی آبادی سے زیادہ ہے، وطن کارڈ حاصل کرنے میں ناکام رہی۔

آبادگاروں اور ہاریوں میں مفت بیج اور کھاد کی تقسیم

وفاقی حکومت نے سیلاب کے نتیجے میں آبادگاروں او رہاریوں کو پہنچنے والے نقصان کے ازالے کے لیے مفت بیج اور کھاد دینے کا اعلان کیا تاہم اس سہولت کے حصول کے لیے ڈھل کی رسید کی فراہمی کی شرط عائد کی گئی۔ ڈھل کی رسید زمینداروں کے پاس ہوتی ہے چنانچہ کھاد اور بیج بھی صرف انہی کو ملے۔ کچے کے علاقوں میں کاشت کاری کرنے والوں کے پاس ڈھل کی رسید نہیں ہوتی کیوں کہ ڈھل صرف نہری نظام سے استفادہ کرنے والوں پر عائد ہوتا ہے، چنانچہ کچے کے علاقوں کے آبادگار اس پیشکش سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔

سماجی اور اقتصادی حالات

سندھ میں پس ماندگی کی بہت سی وجوہ ہیں،جن میں غربت، بے روزگاری،تعلیم کی کمی، اورسیاسی شعور کا فقدان فہرست ہیں، جن کی وجہ سے صوبے کی آدھی سے زیادہ آبادی غیر معیاری زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔

ریاست کے قانون ساز ادارے پس ماندگی اور بے روزگاری کم کرنے کے لیے نئی پالیسیاں بنانے یا پرانی پالیسیاں تبدیل کرتے وقت ان لوگوں کی شمولیت اور مشاورت غیر ضروری تصور کرتے ہیں جن کا معیارِ زندگی بہتر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ نتیجتاً پس ماندگی اور بے روزگاری میں کمی کے بجائے اضافہ ہو رہا ہے۔

اقتصادی ،معاشی اور سماجی طور پر سندھ کے کسان غریب سے غریب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں، تاہم کچے کے لوگوں کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔ 2010ء کے سیلاب نے کچے کے علاقوں میں رہائش پذیر کسانوں کے رہے سہے اثاثے بھی چھین لیے جس کی وجہ سے اُن کے حالات غربت کی سطح سے بھی پست ہو گئے ہیں۔ مذکورہ حالات کا جائزہ لینے کے لیے پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لیبر ایجوکشن اینڈ ریسرچ (پائلر) کی جانب سے کچے کے علاقوں میں رہائش پذیر عوام کے حالاتِ زندگی پر ایک جامع رپورٹ مرتب کرنے کے لیے سروے کیا گیا۔ رپورٹ کی تیاری کے لیے کچے کے علاقوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا،جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

1- گدو بیراج سے سکھر بیراج تک کا علاقہ
2- سکھر بیراج سے کوٹری بیراج تک کا علاقہ ،اور
3- کوٹری بیراج سے انڈس ڈیلٹا تک کا علاقہ۔

اس رپورٹ میں سیلاب سے پہلے اور بعد میں پیدا ہونے والے مسائل اور ان مسائل کی وجہ سے کچے کے علاقوں میں آباد لوگوں کے رہن سہن ، سماجی و اقتصادی حالات اور روزگار پر اثرات اور متاثرین کی نوآبادکاری کے مرحلے کے دوران سرکاری اور نجی اداروں کے کردار کا جائزہ لینے کے ساتھ علاقہ مکینوں کی زندگیوں پر سیاسی عوامل کے اثرات کا جائزہ لینے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اِن لوگوں کے ذرائع آمدن ،معاشی سرگرمیوں اور ریاست کی جانب سے فراہم کردہ بنیادی سہولیات کا جائزہ بھی لیا گیا۔ رپورٹ کے مندرجات کچے کے علاقوں میں رہائش پزیر مکینوں سے سروے کے دوران حاصل کی گئی معلومات پر مبنی ہیں۔ کچے کے علاقوں کے حالات کی بہتر سمجھ بوجھ کے لیے یہاں زیرِ تذکرہ رپورٹ سے اخذ کردہ اہم نکات نقل کیے جارہے ہیں۔

کچے کے گاؤں اور گھروں کا ڈھانچہ

کچے کے علاقوں میں چھوٹے اور بڑے دونوں طرح کے گاؤں ہیں، اکثریت چھوٹے گاؤں کی ہے جن میں دس سے بیس گھرانے آباد ہیں۔ یہ گاؤں ان بے زمین کسانوں کے ہیں جو گزشتہ پانچ سے دس سال کے عرصے میں یہاں آباد ہوئے۔ دوسرے وہ گاؤں ہیں جن میں تیس تا سو گھرانے آباد ہیں، یہ قیامِ پاکستان سے پہلے سے آباد ہیں، ان میں نئی آبادیاں بھی ہیں جو چند سال پہلے آباد ہوئی ہیں۔

کچے کے علاقوں میں تقریباً تمام گھر کچے ہیں، زیادہ تر لکڑی اور جھاڑیوں سے بنے جھونپڑوں پر مشتمل ہیں۔ ان علاقوں میں کچے مکانات دو طرح کے ہوتے ہیں: اول وہ جو محض لکڑیوں کے سہارے کھڑے ہوتے ہیں اور دوم وہ جن میں لکڑی اور مٹی کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں

اینٹوں سے تعمیر ہونے والے پکّے مکانات خال خال، بند کے قریبی علاقوں میں نظر آتے ہیں۔ پکّے یا دوسری قسم کے کچے مکانات نسبتاً بہتر معاشی حالت کے حامل لوگوں کے ہیں جبکہ عام لوگ جھونپڑوں میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ان کے گھروں میں باورچی خانہ الگ نہیں بنا ہوتا، گرمی کی صورت میں گھر کے باہر کھلی فضا میں، جبکہ سردی یا بارش کی صورت میں اکلوتے دستیاب کمرے میں ہی کھانا بنایا جاتا ہے۔ لوگ اپنی بھیڑ بکریاں اپنی چارپائیوں کے ساتھ یا بہت ہی قریب باندھتے ہیں جبکہ گائے یا بھینسوں کے لیے مخصوص جگہ بنائی جاتی ہے۔ گاؤں کی حفاظت کے لیے کانٹے دار درخت کاٹ کر ان کی باڑھ بنا دی جاتی ہے۔

کچے کے علاقوں کے تقریباً تمام گاؤں بجلی کی سہولت سے محروم ہیں تاہم بہت سارے نجی ٹیوب ویل ایسے ہیں جن کے لیے بجلی دستیاب ہے اور قریبی گھر یا گاؤں اس بجلی سے مستفید ہو رہے ہیں۔ عام لوگ رات کے وقت روشنی کے حصول کے لیے مٹی کا تیل استعمال کرتے ہیں۔ ایک بڑی تعداد اُن لوگوں کی بھی ہے جو مٹی کا تیل استعمال کرنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتے اور زندگی اور رات کے اندھیروں کے عادی ہیں۔

پینے کے پانی کی سہولتیں

ڈیلٹا کے کچھ علاقوں کے علاوہ دیگر علاقوں میں زیرِ زمین پانی میٹھا ہے اس لیے پینے کے پانی کے لیے پمپ استعمال کیے جاتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ مشترکہ طور پر ایک یا دو پمپ لگا لیتے ہیں جن سے پورا گاؤں پانی حاصل کرتا ہے، تاہم سمندر کے قریب کے علاقوں میں اکثر جگہوں پر پائے جانے والا پانی انسانی صحت کے لیے موزوں نہیں ہے، اس لیے ڈیلٹا کی آبادی کی اکثریت دریا کے خراب اور کڑوے پانی پر گزارا کرتی ہے یا پھر گاؤں سے دور دستیاب میٹھے پانی کے نلکوں سے پانی حاصل کرنے پر مجبور ہے۔

اسکول

کچے کے بیشتر علاقوں میں کثیر آبادیاں ہونے کے باوجود اسکول موجود نہیں ہیں اسی لیے کچے کی آبادی نسل درنسل ناخواندگی کا شکار چلی آرہی ہے۔ البتہ ڈیلٹا اور دریا کے پشتوں کے قریبی گاؤں میں کہیں کہیں اسکول قائم ہیں، تاہم وہاں اساتذہ نہیں جاتے لہٰذا زیادہ تر اسکول بند پڑے ہیں۔

بنیادی سہولتیں

کچے کے علاقوں میں پکی سڑک اور پبلک ٹرانسپورٹ ناپید ہے۔ لوگ شہر جانے کے لیے موٹر سائیکل، سائیکل اور گدھا گاڑی کا استعمال کرتے ہیں۔ ہنگامی صورت حال یا بیماری میں لوگ شہر سے مال بردار ڈاٹسن منگوا لیتے ہیں لیکن اکثر لوگ ایمرجنسی میں بھی عام طور پر گدھا گاڑی ہی استعمال کرتے ہیں۔ رابطوں کے لیے موبائل فون استعمال کیا جاتا ہے۔ بجلی کی عدم دستیابی کی وجہ سے موبائل فون کی بیٹری چارج کرنا ان لوگوں کے لیے ایک بڑا مسئلہ ہے، لہٰذا موبائل فون چارج کرنے کے لیے ہر دوسرے یا تیسرے دن قریبی شہر یا کسی ایسے گاؤں جانا پڑتا ہے جہاں بجلی دستیاب ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر گاؤں کا کوئی شخص کسی کام سے شہر جارہا ہو تو لوگ اسے اپنا موبائل چارج کرنے کے لیے دے دیتے ہیں۔ کچے کے علاقوں میں پی ٹی سی ایل لینڈ لائن فون کہیں بھی دستیاب نہیں ہے۔

علاج معالجے کی سہولتیں

کچے کے علاقوں میں علاج معالجے کی سہولتیں دستیاب نہیں ہیں۔ لوگ اپنی چھوٹی موٹی تکالیف کے علاج کے لیے روایتی ٹوٹکے استعمال کرتے ہیں۔ کسی بڑی بیماری کے علاج کی ابتداً پیر کے دھاگے یا تعویز سے ہوتی ہے، صرف مریض کی حالت بگڑنے پر ہسپتال یا ڈاکٹر کا رخ کیا جاتا ہے۔ صحت کے حوالے سے زیادہ تکلیف خواتین کو جھیلنی پڑتی ہے۔ تعلقہ

ہسپتال ہالہ کے ایم ایس ڈاکٹر محمد میمن کے مطابق کچے کے علاقوں میں مقیم لوگ صحت کے حوالے سے شدید مسائل کا شکار ہیں[33]۔ ہالا ہسپتال میں ہر روز سات سے آٹھ کیس کچے کے علاقوں سے آتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر مریض کو دیر سے لاتے ہیں، تب تک مریض کی حالت کافی بگڑ چکی ہوتی ہے۔ صحت کی سہولتوں اور زچہ بچہ کی صحت کے حوالے سے گو کہ بہت سی غیر سرکاری تنظیمیں کام کر رہی ہیں تاہم بہتر راستے نہ ہونے کی وجہ سے ان تنظیموں کی لوگوں تک رسائی تقریباً ناممکن ہوتی ہے۔

ذرائع آمدن

کچے کے علاقوں میں رہائش پذیر زیادہ تر لوگوں کا ذریعۂ معاش کھیتی باڑی ہے۔ چند سال پہلے تک جنگلات کی وجہ سے مویشی پالنے کو ترجیح دی جاتی تھی تاہم جنگلات کی بے تحاشا کٹائی کے باعث جانور پالنا بہت مشکل ہے لہٰذا اب صرف گھریلو ضروریات پورا کرنے یا کسی مشکل وقت میں کام آنے کے خیال سے لوگ جانور پالتے ہیں۔ ہر گھر میں دو سے چار تک چھوٹے مویشی موجود ہوتے ہیں جن میں بکریاں اور بھیڑیں وغیرہ شامل ہیں۔

ڈیلٹا کی بیشتر آبادی کا ذریعۂ معاش ماہی گیری ہے لیکن گزشتہ چند برسوں کے دوران ڈیلٹا میں پانی کی کمی کی وجہ سے مچھیروں کا ذریعۂ معاش شدید متاثر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہی گیر تیزی سے سمندر کے کنارے آباد علاقوں کی طرف نقل مکانی کر رہے ہیں۔ کھیتی باڑی سے وابستہ لوگ بھی ڈیلٹا کے علاقوں میں نجی ٹیوب ویل لگا کر زمین کو آباد کرتے ہیں۔ ذرائع آمدن نہ ہونے کی صورت میں لوگ روزانہ کی اجرت پر بھی کام کرتے ہیں جس میں ہر طرح کی مزدوری شامل ہے۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی مہنگائی کے سبب اِن علاقوں میں رہائش پذیر خاندانوں کی کسی ایک ذریعۂ معاش سے گزر اوقات مشکل سے مشکل تر ہوتی جارہی ہے چنانچہ خاندان کے مختلف افراد مختلف کاموں سے وابستہ ہوتے جارہے ہیں۔ یوں کھیتی باڑی، مویشی اور مزدوری سے حاصل شدہ آمدنی شامل کر کے لوگ چھ سے آٹھ ہزار روپے ماہانہ تک

کما لیتے ہیں۔ گو کہ لوگوں کی کی کوشش ہوتی ہے کہ انہیں قرض نہ لینا پڑے، تاہم اکثر اوقات یہ لوگ زمیندار، آڑھتی اور دکانداروں کے مقروض رہتے ہیں۔

ذرائع آمدن پر قدرتی آفات کے اثرات

کچے کے علاقوں میں رہائش پذیر لوگ اوسطاً ہر تیسرے یا چوتھے سال سیلاب کے زد میں آتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے اِن کے ذرائع معاش پر منفی اثر پڑتا ہے۔ سیلاب کی وجہ سے اُن کی فصلیں اور مویشی بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ 2010ء کے سیلاب میں کچے کے سو فیصد علاقے سیلابی پانی میں ڈوب گئے تھے جس کی وجہ سے لوگوں کا گھروں، مویشیوں اور فصلوں کا بڑے پیمانے پر نقصان ہوا تھا[34]۔ سیلاب کے دوران لوگوں کے مویشی کافی تعداد میں بہہ گئے تھے جبکہ بچ جانے والے مویشی سیلاب کے باعث پھیلنے والی بیماریوں کا شکار ہو گئے۔ حکومتی اور نجی اداروں کی تمام تر توجہ سیلاب سے متاثرہ عوام کے لیے رہائش اور خوراک کے بندوبست کی طرف تھی، مویشیوں کے لیے کوئی خاطر خواہ بندوبست نہیں کیا جا سکا، جس کا براہِ راست نقصان لوگوں کے قیمتی اثاثوں کے ضیاع کی صورت میں ہوا۔

کچے کے متاثرین کی بحالی

دریا میں جب بھی سیلاب آتا ہے تو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ کچے کے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ اگر سیلاب درمیانے درجے کا ہو تب بھی کچے کا نقصان ہوتا ہے۔ حکومت کے پاس ایسا کوئی انتظام نہیں ہے جس کے ذریعہ اِن لوگوں کو سیلاب آنے سے پہلے مطلع کیا جا سکے تاکہ وہ خود اور اپنے مویشیوں کو محفوظ مقام پر منتقل کر سکیں یا حکومتی اداروں کی جانب سے کسی قسم کی مدد حاصل کر سکیں۔ 2010ء کے سیلاب میں بھی حکومت نے کچے کے متاثرین کو محفوظ مقامات تک پہنچانے کے لیے کوئی معقول بندوبست نہیں کیا تھا۔ لوگ اپنی مدد آپ کے تحت، مال مویشی بیچ کر گاڑیوں کو کرایہ ادا کر کے دریا کے پشتوں پر آ بیٹھے تھے۔ اُنہوں

نے کیمپوں کا رُخ اس لیے نہیں کیا کہ ان کے ساتھ ان کے مال مویشی بھی تھے اور وہ مویشیوں کو چھوڑ کر نہیں جاسکتے تھے۔ یوں بہت کم امدادی ٹیمیں ان تک پہنچ سکیں۔ سیلاب گزر جانے کے بعد بھی حکومت کی جانب سے کچے کے متاثرین کے نقصان کے ازالے کے لیے کوئی قابلِ ذکر پروگرام متعارف نہیں کرایا گیا۔

اس وقت بھی سیلاب زدگان کی بحالی کو دیکھا جائے تو کچے کے متاثرین کے لیے حکومت اور غیر سرکاری تنظیموں کے پاس ایسا کوئی پروگرام نہیں جس سے انہیں کوئی فائدہ پہنچ سکے۔ کچے کے متاثرین، اپنی بحالی کے لیے خود ہی مصروفِ عمل ہیں۔ اپنی مدد آپ کے تحت ہونے والی اس بے ہنگم بحالی کے سبب، کچے کے مکینوں نے ایک بار پھر کچے کے انہی علاقوں میں تعمیرات شروع کردیں ہیں جو 2010ء کے سیلاب میں تباہی سے دوچار ہوئے تھے۔

امن و امان کی صورتحال اور برادریوں کی طاقت کا روزگار پر اثر

کچے کے مختلف علاقوں میں مختلف برادریوں کا اثر و رسوخ ہے۔ مثلاً کشمور سے سکھر تک مہر برادری کا نسبتاً زیادہ اثر و رسوخ ہے، خیر پور میں کھوڑو برادری اور سادات جبکہ مورو، سکرنڈ اور دولت پور کے علاقوں میں سادات کا اثر و رسوخ زیادہ ہے۔ دادو کے کچے کے علاقوں میں جتوئی برادری، ٹیاری اور جام شورو کے کچے کے علاقوں میں کھوسو، سولنگی اور سموں کی برادریاں زیادہ بااثر ہیں۔ اسی طرح ٹھٹھہ میں شیرازی، خاصخیلی اور کچھ حد تک ملاح برادری کا اثر و رسوخ ہے۔

امن و امان کی صورتحال سندھ کے دیگر علاقوں کی نسبت کچے کے علاقوں میں کافی بہتر ہے، لیکن ان برادریوں کے درمیان زمینوں کی ملکیت، درخت کاٹنے اور قبضہ کی ہوئی زمینوں کی حدود کے تعین کے لیے تصادم ہوتے رہتے ہیں۔ ان تمام برادریوں کے اثر ورسوخ کے پیچھے کسی نہ کسی سیاسی یا بااثر شخصیت کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔ مزدور طبقہ، مثلاً دیہاڑی مزدُور یا موسمی مزدور جو باہر کے علاقوں سے فصلوں کی کٹائی کے وقت آتے ہیں، ان کے لیے کوئی

مسئلہ نہیں ہوتا اور وہ بھی کسی تنازعے میں ملوث نہیں ہوتے۔ عام آدمی کچے کے علاقوں میں کسی با اثر برادری کی مدد کے بغیر زمین ٹھیکے یا لیز پر نہیں لے سکتا، بصورتِ دیگر انہیں مختلف حوالوں سے ڈرایا دھمکایا جاتا ہے۔

سماجی، سیاسی اور طبقاتی محرومیاں

بنیادی سہولتوں کا ڈھانچہ نہ ہونے کے وجہ سے کچے کے رہائشی، عام شہریوں سے کافی پیچھے ہیں۔ اُن کی معلومات تک رسائی دیگر لوگوں کی نسبت بہت کم ہے، اس وجہ سے یہ لوگ بنیادی سہولتوں تک رسائی سے بھی محروم ہیں۔ زرعی پیداوار اچھی ہونے کے باوجود سڑکیں نہ ہونے کی وجہ سے مارکیٹ میں ان کا مال بہ حفاظت اور اچھی حالت میں نہیں پہنچتا، جس کی وجہ سے ان کی اشیأ کی قدر گر جاتی ہے۔

تعلیم کی کمی کی بنا پر ان میں سیاسی و سماجی شعور کی شدید کمی ہے، جس کے نتیجے میں یہاں کے لوگوں میں رسوم و روایت اور پیری فقیری پر اعتقاد باقی سندھ کے عوام کی نسبت زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس رجحان کا فائدہ سیاسی اور بااثر لوگ زیادہ اٹھاتے ہیں کیونکہ کچے کی زمین پر قبضہ کرتے وقت لوگ انہی با اثر شخصیات کا سہارا لیتے ہیں۔ قانون نافذ کرنے والا کوئی ادارہ جب زمین پر ناجائز قبضے کے خلاف حرکت میں آتا ہے تو بااثر شخصیات ناجائز قابضین کی پشت پناہی کرتی ہیں۔ سماجی بے ترتیبی کے باعث اِن لوگوں میں قبائلی تقسیم خاصی نمایاں نظر آتی ہے، عام لوگوں کی نسبت ان میں گرم مزاجی بھی زیادہ پائی جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر برادریوں کے درمیان انا پرستی، لڑائی جھگڑے اور ناراضگیاں، ان لوگوں کے رسم رواج کا حصہ ہیں۔

چیف جسٹس آف پاکستان کا کچے میں قبضہ مافیا کے خلاف اقدام

گزشتہ حکومت نے قدرتی آبی گزرگاہوں سے قبضے ختم کرانے کے لیے 2011ء میں آبپاشی

ایکٹ 1879ء کی دفعہ 62 میں ترمیم کر کے تجاوزات کے حوالے سے قانون بنایا تھا جس کے تحت سندھ کی تمام قدرتی آبی گزرگاہوں سے قبضے ختم کیے جاسکتے ہیں[35]۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے اس قانون پر عمل درآمد کا حکم دیتے ہوئے سیکریٹری آبپاشی سندھ کو حکم دیا کہ کچے کے علاقوں میں قائم نجی بند اور قبضہ مافیا کے خلاف اقدامات کریں اور جلد از جلد سپریم کورٹ کو رپورٹ پیش کی جائے۔ سیکریٹری آبپاشی نے سپریم کورٹ کے حکم کی تعمیل میں کچے کے علاقوں کا دورہ کیا اور عدالت کو اپنی رپورٹ کے ساتھ ان لوگوں کے نام بھی پیش کیے جنہوں نے کچے کے علاقوں میں اپنی فصلوں کو سیلاب سے بچانے کے لیے نجی بند باندھ رکھے ہیں، ان میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو گزشتہ حکومتوں میں صوبائی اسمبلی کے رکن رہ چکے ہیں۔ ان میں مرتضیٰ جتوئی، لیاقت جتوئی اور سابق گورنر پنجاب مخدوم احمد محمود جیسے نام بھی شامل ہیں[36]۔

اگرچہ پہلے بھی ایسے اقدامات ہوتے رہے ہیں لیکن با اثر شخصیات کے خلاف کارروائی نہیں کی جاتی بلکہ کچھ غریب لوگوں کو گرفتار کر کے اُن کے خلاف مقدمے درج کر لیے جاتے ہیں جو سالہا سال چلتے رہتے ہیں۔ ان مقدمات سے تنگ آ کر غریب لوگ اِن علاقوں کو ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ یوں اُن کی چھوڑی ہوئی زمین پر با اثر افراد قبضہ کر لیتے ہیں۔

حاصلِ مطالعہ

دریائے سندھ کا پانی نہروں کے ذریعے پاکستان کی تمام زرعی اراضی کو سیراب کرتا ہے تاہم موسمی تبدیلیاں اس پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں اور یوں اس دریا میں کبھی سیلاب کی صورت حال ہوتی ہے تو کبھی پانی ہی نہیں ہوتا۔محکمۂ آبپاشی کی غفلت اور بے پرواہی کے رویے نے بھی دریا کے قدرتی بہاؤ کو نقصان پہنچایا۔ مختلف ادوار میں تیار ہونے والی جنگلات کی پالیسیوں نے دریائی جنگلات کو تباہی سے دوچار کیا جب کہ کچے کے علاقوں میں درختوں کی کٹائی کرکے زمینوں کو زرعی استعمال میں لایا گیا۔جاگیرداروں نے سیاسی اثرورسوخ کا استعمال کرتے ہوئے کچے کے علاقوں میں ہزاروں ایکڑ اراضی پر قبضہ کر کے کیٹیاں (کیٹی دریا کے اس زمینی حصے کو کہتے ہیں جس کے کم ازکم دو اطراف میں دریا کا پانی ہو) بنالیں اور پکے کے علاقوں سے بے زمین ہاریوں کو بسا دیا جس سے کچے کی مقامی آبادی ہر لحاظ سے متاثر ہوئی۔

ماضی میں قدرتی آبی گزرگاہوں پر قبضہ ختم کرانے کے حوالے سے قانون کی عدم موجودگی نے دشواریاں کھڑی کیں، تاہم حکومتِ سندھ نے 1879ء کے آبپاشی کے قانون کی دفعہ 62 میں ترمیم کرکے آبی گزرگاہوں پر تجاوزات کے خلاف قانون منظور کرکے بڑی رکاوٹ ختم کردی ہے[37]۔ اب حکومت پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ پانی کے قدرتی ذرائع پر موجود قبضے ختم کروائے لیکن اس سے بھی بڑا چیلنج یہ ہوگا کہ قبضے کے خاتمے کے نتیجے میں کچے کی جو پینتیس لاکھ آبادی بے دخلی کا شکار ہوگی اس کے لیے روزگار فراہم کیا جائے جو انتہائی

پیچیدہ معاملہ ہے۔ گزشتہ دنوں وزیرِ اعلیٰ سندھ نے بیان دیا تھا کہ صوبائی حکومت کے پاس کچے میں جنگلات اگانے کے لیے درکار سرمایہ دستیاب نہیں ہے۔حکومت کو چاہیے کہ وہ ان زمینداروں کو جنگلات اُگانے کا حکم دے جنہوں نے یہ زمینیں لیز پر لے رکھی ہیں۔ تاہم یہ بیان کچے کی زمین پر سے قبضے کے خاتمے کے لیے حکومت کی عدم سنجیدگی ظاہر کرتا ہے۔ سیلاب کے دو سال بعد بھی حکومت کی جانب سے کچے کے علاقوں میں غیر قانونی آبادی اور زرعی سرگرمیوں کی روک تھام کے لیے کسی قسم کے اقدامات نہیں کیے گئے۔اس صورتحال میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مستقبل میں بھی دریائے سندھ کو بڑے سیلابی ریلوں کا سامنا رہے گا، لوگ اسی طرح برباد ہوتے رہیں گے اور حکومت کے اقدامات بیان بازی تک محدود رہیں گے۔ ایسے میں زیادہ تر نقصان ان لوگوں کو ہوتا ہے جو دریاؤں کے کنارے یا اندر کے علاقوں میں آباد ہیں۔

سفارشات

1 محکمۂ جنگلات کی زمین کو لیز پر دینے کے سلسلے کو فوری طور پر ختم کر کے کچے کے علاقوں میں نئے جنگلات اُگائے جائیں۔ کچے کے جنگلات سیلاب کی صورت میں حفاظتی پشتوں پر پانی کا دباؤ کم کرنے میں مدد گار ثابت ہوتے ہیں اور دریا کے ایکوسسٹم کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی توازن برقرار رکھتے ہیں۔

2 جنگلات کی کٹائی پر عارضی طور پر پابندی کر دینی چاہیے۔ کئی درخت تیار ہونے میں کم از کم تین سے چار سال کا عرصہ لیتے ہیں اور اگر ان کی کٹائی وقت سے پہلے کی جائے تو وہ ختم ہو جاتے ہیں چنانچہ جنگلات کی کٹائی پر کم از کم پانچ سال کے لیے پابندی لگائی جائے۔

3 کچے میں جنگلات کی کٹائی مختلف مقاصد کے لیے جاری رہتی ہے۔ ضروری ہے کہ کچے کے علاقے میں درخت کاٹنے کے عمل کو جرم قرار دیا جائے اور قانون کی خلاف ورزی پر سخت سزا اور جرمانہ مقرر کیا جائے۔

4 کچے کی زمین پر قبضہ معمول بن چکا ہے۔ 11-2010ء کے سیلاب میں ہونے والی تباہی کے بعد حکومتِ سندھ نے سرکاری زمینوں پر سے قبضے کے خاتمے کے لیے 2011ء میں انسدادِ تجاوزات کا قانون منظور کیا تھا۔ حکومت کو اس قانون کے تحت کارروائی کرتے ہوئے تجاوزات کا فوری خاتمہ کرنا چاہیے۔

5 2010ء کے سیلاب کے بعد یہ بات بھی سامنے آئی کہ کچے کے علاقوں میں بہت سے نجی بند بھی بنائے گئے ہیں، جو سیلابی پانی کی راستے میں رکاوٹ بن گئے تھے۔ایسے بند بنانے والے جاگیرداروں اور بااثر افراد کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی کی جائے۔

6 کچے کی زمین کا ازسرِنو سروے کر کے ریکارڈ کمپیوٹرائزڈ کیا جائے۔

7 دریا میں سیلاب اکثر خریف کے موسم میں آتا ہے۔ لوگوں کو نقصان سے محفوظ رکھنے کے لیے حکومت کو کچے کے علاقوں میں خریف کی فصل اُگانے پر پابندی لگانی چاہیے۔

حوالہ جات:

1. A.A Misto Report prepared by British government to understand Irrigation plan in Sindh which was published in (1921) translation, Abul Qadir Junejo
2. W.W.F (2008) Study of Riverine forestss upstream Sukkur and downstream Kotri, Sindh, Pakistan
3. M.H Panhwar (2002) Water Requirement of Riverain area of Sindh, Sind Education Trust, Hyderabad, Sindh
4. http://www.nation.com.pk/karachi/06-Aug-2012/ call-made-for-abolition-of-lease-policy-to-save-forests
5. Board of Revenue, government of Sindh, katcha land
6. Report of Supreme Court Judicial inquiry on Breaches on flood 2010
7. Aziz Ranjhani (2012) Heavy flood 2010-11
8. Interview with Idrees Rajpu, Feb 4,2012
9. W.W.F (2008) Study of Riverine forest upstream Sukkur and downstream Kotri, Sindh, Pakistan
10. UNDP(2011) Report on Milleneim development Goal of Sindh
11. http://www.borsindh.gov.pk/index.php?/page=katcha.land
12. ibid
13. ibid
14. Pakistan Today,14/7/2011
15. http://www.borsindh.gov.pk/index.php?/page=katcha.land
16. Dr. Ismail (2011) Assessment of Deforestation of Riverine Forest of Nawabshah & Hyderabad Divisions using landsat Data
17. http://www.borsindh.gov.pk/index.php?/page=katcha.land
18. WWF(2008) Study of Riverine forest upstream Sukkur and downstream Kotri,Sindh, Paksitan
19. Interview with Hakeem Khoso,a residence of Katcha, April 7,2012
20. http://dailynews.net.pk/july2011/11-07-2011/former.asp
21. Ahmed, J. and Mahmood, F (1998) Changing Perspective on Forest Policy; Policy that Works for Forests and People, Pakistan Country Case Study, IUCN, Islamabad, Pakistan
22. ibid

23. WWF(2008) Study of Riverine forest upstream Sukkur and downstream Kotri, Sindh, Pakistan
24. Dr. Ismail Rakip Karas (2011) Assessment of Deforest of Riverine Forest of Nawabshah & Hyderabad، Division Using Landsat Data
25. Javed Ahmed, Fawad Mahmood: Changing perspectives on forest policies, IUCN
26. ibid
27. http://www.differencebetween.net/ miscellaneous/difference-between-urban-and-rural
28. Haroon Jamal (2007) updating poverty and Inequality Estimates:2005 Panorma, SPDC
29. http://www.sindh.gov.pk/aboutsindh.htm
30. M.H. Panhwar، (1983) 5000 years of irrigation in Sindh 'Failure of a gate of Sukkur Barrage and lesson for future, Sindhological Studies
31. Inverview with Hakeem khoso, Katcha Salaro taluka Hala,during phonic conversation, April, 7,2012
32. Highlighted by a member during the group discussion in katcha area, 4 March, 2013.
33. Interview with M.S Dr. Mohammad, Memon,Taluka Hospital, Hala new, 5 March, 2013.
34. Highlighted by a member during the group discussion in katcha area, 4 March, 2013.
35. M.Idrees Rajput (2011)Rain flood and grief of Sindh" Sindh National AcademyTrust.Hyderabad
36. Daily Kawish, 21 March 2013.
37. M.Idrees Rajput(2011) Rain flood and grief of Sindh, Sindh National Academy Trust.Hyderabad,